ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۲۳

دوسرا سال: گیارہویں کتاب

نومبر ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey@poetic.com
فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

کمپوزنگ: اظہر خان (یونی کارن کمپیوٹرز چونگی نمبر ۶ ملتان)
مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

بیادِ ابن حنیف

ترتیب

۱۔ چند باتیں	سید عامر سہیل	۳
ابنِ حنیف ۔۔ شخص اور عکس:		
۲۔ ثنائے حیات و رثائے وفات............	اصغر علی شاہ	۵
۳۔ ابن حنیف ۔ شخص تنہا سا	ڈاکٹر سلیم اختر	۷
۴۔ مرزا ابن حنیف ۔۔ خاک میں کیا صورتیں	ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف	۱۰
۵۔ آنکھیں ساتھ چلی جاتی ہیں	غلام حسین ساجد	۱۵
۶۔ جرائد میں طبع شدہ مرزا ابن حنیف کے منتخب مضامین	ڈاکٹر شگفتہ حسین	۲۳
۷۔ عجب آزاد مرد تھا	ڈاکٹر نعمت الحق	۳۰
۸۔ میرے والد	سمیرا احمیریں	۳۷
۹۔ ابن حنیف کی تصنیف ''سات دریاؤں کی سرزمین''......	سمیرا احمیریں	۴۵
۱۰۔ مرزا صاحب ۔۔ احوال پہلی اور آخری ملاقاتوں کا	رضی الدین رضی	۶۹
۱۱۔ ابن حنیف ۔۔ چند یادیں	شوکت نعیم قادری	۶۹
۱۲۔ مرزا ابن حنیف ۔ علم کا ایک بہتا دریا	ایم۔ خالد فیاض	۷۴
۱۳۔ مرد افگن عشق	خالد محمود سنجرانی	۷۹
۱۴۔ ہمیں جانتے ہیں کہ وہ شخص	ناصر حسین بخاری	۸۶
۱۵۔ مرزا صاحب ۔۔ ایک شخصیت، ایک عہد	لیاقت علی	۸۸
رپورٹ:		
۱۵۔ تعزیتی اجلاس ملتان آرٹس فورم ملتان	رپورٹ: عطاالرحمٰن تمثیل	۸۶

سید عامر سہیل

چند باتیں

اصغر علی شاہ

ثنائے حیات و رثائے وفات
برائے مرزا ظریف بیگ ابن مرزا حنیف بیگ مرحوم و مغفور

سال اک اور تیس میں ماہ دسمبر تیس کو
حکمِ خالق تھا ظرافت کو زمین پر بھیج دو

گاؤں تھا معکوس[1] کلیانہ رجانہ در حصار
بن گیا مولد جہاں پیدا ہوا یہ نامدار

گرچہ اصلی والدینی نام تھا اس کا ظریف
رکھ کے والد کو مقدم بن گیا ابنِ حنیف

شہر تعلیمی رہے ملتان کرنال اور حصار
ابتدا سے انتہا تک کیجیے الٹا شمار

باعثِ ترغیبِ آثارِ قدیمہ جو ہوئی
بی۔اے میں تاریخ کے مضموں میں رہ جانا بنی

علمِ آثار قدیمہ کے لیے کھولا گیا
نام جس کا چھانٹ کر دانش کدہ رکھا گیا

تھا مگر ابنِ حنیف انجان کاروبار کا
تشنگی علمی بجھائی پر خسارے میں رہا

سب ایڈیٹر بن کے پھر امروز کو چھاپا کیا
ساٹھ سالہ ہو کے اس اخبار سے فارغ ہوا

ساتھ رکھے کام جاری ترجمہ تحقیق کے
ایک[2] اشاعت اور دو[3] انعام بھی حاصل کیے

چار سن جانکاہ بیماری نے آ گھیرا اسے
ساتھ اپنے لے چلا یہ موت کا پھیرا اسے

الغرض انتیس جولائی سویرے چھ بجے
دل نے اس کا ساتھ چھوڑا تو پھر اس نے دم دیئے

دائماً دیرینہ تہذیبوں میں جو کھو کھو گیا
اب وہ خود ہی جزوِ آثارِ قدیمہ ہو گیا

مرکزِ آں سرزمیں مدفن بنا جس شخص کا
سات[4] دریائی زمیں تحقیق کا موضوع تھا

جس کی ہے تصنیف[5] گل گامش کتھا کا ترجمہ
مرثیے کی شکل میں ہے اس کی محنت کا صلہ

جس نے بتلایا ہزاروں[6] سال پہلے جو ہوا
آج برپا ہو رہا ہے ماتم اس کی موت کا

کس طرح تخلیق کی[7] اللہ نے یہ کائنات
رازِ سربستہ ہوئی ہے آج اس عارف کی ذات

کیسے تھے کہنہ زمانے میں مصور[8] مصر کے
مرنے والے نے انہیں الفاظ کے خاکے دیے

دی خبر دنیا کا جو ہے سب سے[9] پارینہ ادب
کم نہیں سہ بار اشاعت نے بھی اس کی طلب

چار جلدوں میں چھپا ہے مصری[10] دیرینہ ادب
یہ ادب سارے جہاں میں اوّلین و منتخب

مصر یونان اور بھارت کی کہانی جو بھی تھی
بھولی[11] بسری ہو چکی تھی حافظے کو اس نے دی

سب سے آخر میں لکھی پنجاب[12] کا ہے جو جنوب
رکھتا ہے یہ خطہ آثارِ قدیمہ خوب خوب

کہنہ قلعہ پر کھدائی جب ہوئی ملتان میں
صرف وہ آثار متلاشی تھے پاکستان میں

جون جولائی کی گرمی اوٹ کر ابنِ حنیف
کہنہ اشیاء کو وہاں سے لایا گھر ابنِ حنیف

جامعہ میں مرکزِ تحقیق جو ہے سرائیکی
بولتی ہے اس کی اشیاء میں ظریفی خامشی

لکشمی[13] نے دھن کی دیگوں پر بٹھائے سانپ کیوں
اور شِو نے اپنی گردن میں ہیں ڈالے سانپ کیوں

عمرِ آخر میں تھی فکر اژدھاؤ مار اسے
مار دلدادہ نظر آتا تھا ہر اَوتار اسے

سانپ نے اس کو بڑھاپے میں ڈسا تھا ایک بار
اس لیے شاید کہ یہ تحقیق کی ہو اختیار

لیکن اس تحقیق کو پورا نہیں کر پایا وہ
خاندان افراد کو روتا ہوا چھوڑ آیا وہ

دختران و زوجہ کو داغِ جدائی دے گیا
اور ہمیشہ کے لیے ان سب کی خوشیاں لے گیا

مرثیہ لکھ اور اس کی زندگی کو یاد کر
دل غم و اندوہ سے اَشکوں سے چشم آباد کر

دے اشاعت کے لیے عالم کے مرنے کی خبر
اور اک عالم کو پاکستان میں ناشاد کر

شہر ہو غمگین گھر والے منائیں اس کا سوگ
داد دیتا تھا جنہیں وہ اب انہیں بے داد کر

اُٹھ گئی خودداری غیرت اور مروّت مر گئیں
کیسے اوصاف حمیدہ وہ گیا برباد کر

چاک داماں ہے شرافت اور متانت ننگے سر
اور خموشی نے لیا اپنے تئیں فریاد کر

ہوک اُٹھا دل سے جگر سے درد کی ہائے نکال
کھینچ کر آئیں لبوں سے ان کو نذر باد کر

سارے اہلِ علم کو تکرار سے شیون سنا
قدر دانوں کے لیے تو بین سب آزاد کر

جانِ آثارِ قدیمہ شخصیت کا نوحہ پڑھ
ٹیپ کا دل سوز مصرع بار بار ارشاد کر

مرنے والے کے لیے شیون فغاں بے کار سب
جانے والے کو بنا دیتی ہے مرگ اُفتاد کر

دُکھ کے ماروں کے لیے کیجیے دعا کہ اے خدا
صبر کی نعمت کے نازل کرنے میں امداد کر

فن آثارِ قدیمہ جاری و ساری رہے
شہر ملتاں میں نیا ابنِ حنیف ایجاد کر

(۱) گاؤں کا اصل نام رجانہ کلیانہ ہے ۔ (۲) مصر کا قدیم ادب نامی کتاب پر اکادمی ادبیات نے اوّل انعام دیا۔ (۳) دوسرا انعام مبلغ -/40,000 روپے بطور ہجرہ ایوارڈ ملا۔ (۴) سات دریاؤں کی سرزمین۔ (۵) گل گامش کا داستاں۔ (٦) ہزاروں سال پہلے۔ (۷) تخلیق کائنات۔ (۸) مصر کی قدیم مصوری۔ (۹) دنیا کا قدیم ترین ادب۔ (۱۰) مصر کا قدیم ادب۔ (چار جلدیں) (۱۱) بھولی بسری کہانیاں (مصر، یونان، بھارت) الگ الگ تین کتابیں۔ (۱۲) جنوبی پنجاب کے آثارِ قدیمہ۔ (۱۳) سانپوں سے متعلق تحقیق مکمل نہ کر سکے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سلیم اختر

ابنِ حنیف۔ شخص تنہا سا!

آج کا ملتانی چالیس بیالیس برس قبل کے ''نواں شہر'' کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اب اس کی وہ صورت نہیں رہی جو ۱۹۶۲ء میں تھی۔

میں ایمرسن کالج میں لیکچرار (اُردو) بن کر آیا تو نواں شہر ہی میں آٹھ برس گزرے، اس وقت یہاں ''باغیچۂ اطفال'' کے نام سے ایک خشک اور بے آب وگل، نام نہاد باغیچہ تھا اسی سے متصل بائیں ہاتھ کی گلی میں ابنِ حنیف کا مکان تھا۔ چند دوکانوں کے بعد بائیں ہاتھ کی ایک اور گلی میں مقصود زاہدی آباد تھے۔ ان کے مکان کے سامنے عرش صدیقی کی سسرال شریف تھی جہاں وہ بہاولپور روڈ پر اپنا مکان بنا لینے تک مقیم رہے، تھوڑا مزید چلیں تو دائیں ہاتھ کی ایک تنگ گلی کا آخری مکان میرا تھا جس کے سامنے والے مکان میں وہ بکری بندھی رہتی تھی جس کے وضع حمل پر میں نے افسانہ ''بکری'' قلم بند کیا تھا، ایسا افسانہ جو مدتوں میری پہچان بنا رہا۔

ان شخصیات کی بنا پر چھٹی دہائی کے ''نواں شہر'' کو ''چیلسی'' قرار دینا، شاید مبالغہ نہ ہو۔ میں آج کے ''چہروں'' کا جب اس زمانہ کے ادبی چہروں سے مقابلہ کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ چھٹی ساتویں دہائی کا ملتان نقد و تحقیق، شاعری اور افسانہ سے وابستہ کیسی کیسی شخصیات کو اپنے دامن میں لیے تھا۔ چند نام جو فوری طور پر ذہن میں آ رہے ہیں علامہ عتیق فکری، سید قدرت نقوی، عین الحق فرید کوٹی، جابر علی سید، مسعود اشعر، عرش صدیقی، نذیر احمد، فرخ درّانی، ارشد ملتانی، یہ تو تھے سینئرز جب کہ جوانوں میں اسلم انصاری، انوار انجم کے نام فوری طور پر ذہن میں آ رہے ہیں۔ آج کی بڑی بڑی بلائیں جیسے ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر رؤف شیخ، ڈاکٹر صلاح الدین حیدر، محسن نقوی یہ سب طالب علم تھے میں اس زمانہ کی مشہور طالبات کے نام نہیں لکھ رہا مبادا سر کی کلرنگ کے باوجود درست عمر کا اندازہ ہو جائے تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر روبینہ ترین اس وقت بہت ہی چھوٹی سی بچی تھی جب کہ ڈاکٹر شگفتہ حسین ابھی ایجاد نہ ہوئی تھی۔

ابنِ حنیف کا ادیبوں کی اس فہرست میں اس لیے نام درج نہیں کیا کہ مرحوم کا نام ادیبوں کی کسی بھی فہرست میں درج نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اساطیر کا محقق تھا۔ اُردو میں انواع واقسام کے محققین پائے جاتے ہیں، کامل اور خام بھی، کتاب چور اور حوالہ چور بھی مگر ابنِ حنیف ماضی کے محققین کے ساتھ ساتھ معاصر محققین میں بھی اس بنا پر ممتاز تھے کہ انہوں نے خود کو صرف اساطیر اور آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کے لیے

وقف کر رکھا تھا۔

یہ مختصر تاثراتی مضمون انسانی تاریخ میں اساطیر کی اہمیت اور مذہبی تناظر کی طویل وضاحت کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ تحقیق کی ہر بڑی تہذیب عظیم اساطیر کی بھی حامل تھی، مصر، ہندوستان، چین، بابل وغیرہ کی تہذیبوں کی اساطیر کا مطالعہ بالخصوص تقابلی مطالعہ، آج کے مادی انسان کو دانش کے نئے زاویوں سے روشناس کرا سکتا ہے۔ انگریزی کی وجہ سے ہم صرف یونانی اور رومن اساطیر ہی سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں جب کہ مشرق کی اقوام اور ممالک کی اساطیر اپنے اندر عجب دلکشی رکھتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ قاری علمی دلچسپی کے ساتھ ساتھ کشادہ ذہن بھی رکھتا ہو، ورنہ وہ لاحول پڑھ پڑھ کر تکفیر کرتا رہے گا اسی رویہ کی بنا پر ہمارے ہاں مائی تھالوجی کا ترجمہ ''خرافیات'' کیا جاتا رہا ہے اور ابنِ حنیف نے عمر اسی خرافیات کی تفہیم وتشریح میں بسر کر دی۔

میں نے جتنی بھی ایسی شخصیات کا قریب سے مطالعہ کیا جنہوں نے کسی بھی شعبہ میں خصوصی نام پیدا کیا تو ان سب کو یک رُخے ذہن کی حامل پایا بلاشبہ ابنِ حنیف بھی یک رُخے ذہن کے حامل تھے کہ عمرِ عزیز شوقِ عزیز کے لیے وقف کر دی۔

میرا نیا نیا گھر بسا تھا اور میں مہینہ بھر کی چیزوں کی لسٹ جیب میں ڈالے، حسین آگاہی جا رہا تھا کہ سائیکل کو جیسے خود بخود بریک لگ گئی سامنے بورڈ تھا ''دانش کدہ'' میں نے سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کی، باہر ایک چھوٹے سے کاؤنٹر پر پتلا دبلا شخص، کتاب میں محو تھا، میں نے الماریوں میں رکھی کتابوں پر ایک نگاہ ڈالی تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ ملتان جیسے شہر میں کتابوں کی یہ دوکان اساطیر پر بہترین کتابوں کی حامل تھی ساتھ ہی اینتھروپولوجی، قدیم تواریخ اور اسی نوع کی دیگر کتابیں سج رہی تھیں یا مظہر العجائب! ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے۔

اب تک میں نے یہ نہیں لکھا کہ خود مجھے بھی اساطیر، اینتھروپولوجی، قدیم تمدنوں کی تاریخ اور مردہ تہذیبوں کے مطالعہ کا شوق ہے۔ ابنِ حنیف سے ملتان میں ملاقات سے پہلے میں لاہور میں مطبوعہ ان کی جملہ تصانیف خرید چکا تھا۔ مہینہ بھر کے سودے کی لسٹ گئی بھاڑ میں، مجھے معلوم تھا کہ مہینہ بھر کی چینی، چاول، دالوں اور دیگر اشیاء کے بغیر گھر آنے پر بیوی بولے گی لیکن پھر سوچا بیویاں تو بدلتی ہی رہتی ہیں، ایسی اچھی کتابیں نہ ملیں گی، بُل فینچ، مارگریٹ سیڈ، ایرک فرام، یونگ، فریزر ____ ملتان میں؟

ابنِ حنیف سے میرا یہ پہلا تعارف تھا اور جلد ہی ان کے ''دانش کدہ'' پر باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم دونوں کی مشترک دلچسپی اساطیر تھی، ابنِ حنیف بہت کم گو اور لیے دیئے رہنے والا تھا ادھر میں بھی ہر ایک سے جلدی سے گھل مل نہیں سکتا لیکن مشترک دلچسپی کی وجہ سے ہم پہروں باتیں کرتے رہتے پھر گھر آنا شروع ہو گیا، اگرچہ وہ جان جائے مگر کتاب نہ جائے کے قائل تھے مگر مجھ پر اعتبار کر لیتے تھے لطیف الزّماں خاں کی مانند!

ہمارے ہاں اکثریت ایسے اصحاب کی ہے جو علمی جستجو کو شرک اور کفر کی سطح تک لے آتے ہیں اسی لیے اساطیر جیسے کافرانہ علوم کا مطالعہ اس بنا پر مذموم کہ ہم توحید پرست ہیں اسی رویہ کی وجہ سے ہمارے ہاں اب بھی سائنس کو مشکوک سمجھا جاتا ہے کہ یہ دین سے بیگانہ کرے گی مگر یہ امر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ہماری دینداری میں بے دینی کی کتنی ملاوٹ ہے۔

عہد اساطیر میں فطرت کے مظاہر اور خود انسانی فطرت کی تفہیم کے لیے دیوتا اور دیویاں مقرر تھیں یونان میں فنونِ لطیفہ کی سرپرست تو دیویاں تھیں جو MUSE کہلاتی تھیں، میوزیم اور میوزک جیسے الفاظ ''میوز'' ہی سے بنائے گئے۔ ہندوؤں میں علوم، شعر، موسیقی اور خطاطی کی دیوی اور ہوتی تھی، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرسوتی دیوی کے زیر اثر، عہدِ عتیق کی کوئی بھٹکی ہوئی روح تھی، جس نے ہمارے ہاں جنم لیا، ملتان میں سکونت اختیار کی اور ابنِ حنیف کے نام سے اساطیر کو زندہ کرنے کے لیے کتابیں تحریر کیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، شاید میں بھی کسی قدیم تمدن کی مفرور روح ہوں، غالباً میں پانچویں کھونٹ میں بھٹکتا پھرتا کہ فرائیڈ نے انگلی تھام لی اور سائیکی کی پھیلی ہوئی پرچھائیوں کی دنیا میں لے آیا۔

ابنِ حنیف اور اس جیسے تمام حضرات جاہل معاشرہ اور کاٹھ کے لوگوں میں مِس فٹ ہوتے ہیں اس لیے تنہائی ایسے افراد کا مقدر ہوتی ہے۔ ابنِ حنیف بھی

میری مانند خود نگر تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا

کی تصویر تھا لیکن ایک بات ہے کہ اس نے اپنی شرائط پر زندگی بسر کی، اسے سمجھوتہ پسند نہ تھا، نرم خُو مگر اُصولوں کے معاملہ میں فولاد، اسی لیے صلہ وستائش سے بے نیاز رہا اور مشرف بہ اسلام آباد نہ ہوا، اس نے اساطیر کی کتابوں کی معیت میں ماضی میں زندگی بسر کی اور حال میں بھی ماضی ہی کو دیکھا بلکہ بحثیت فرد اپنا مستقبل بھی ماضی ہی سے وابستہ کیے رکھا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆

ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف

''مرزا ابنِ حنیف۔خاک میں کیا صورتیں''

بارہ تیرہ سال بعد پہلی بار گرمیوں کے کم بخت موسم میں میں پاکستان آیا۔ شاید اپنے محترم دوست مرزا ابنِ حنیف کے جنازے کو کندھا دینا قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ انقرہ سے روانہ ہونے سے دو ہفتے پہلے ڈاکٹر انوار احمد کا ای میل مجھے ملا تھا جس میں مرزا صاحب کی علالت اور کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہونے کا ذکر تھا۔ ملتان پہنچتے ہی دوسرے روز مرزا صاحب کے گھر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ غالباً ٹیکے کے اثر سے نیم بے ہوش سے تھے۔ میں ان کے پاس کرسی پر بیٹھا رہا لیکن انہیں جگایا نہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ میرے سامنے بستر پر دراز تھا۔ کتنا متحرک، کتنا مستقل مزاج، کتنا حوصلہ مند، کتنا پُر عزم انسان آج کتنا بے حِس و حرکت، کتنا بے بس، کتنا لاچار پڑا تھا۔ بھابھی اور بیٹیاں حسرت و یاس کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ اُنہیں جگائے بغیر اُٹھ کر چلا آیا۔

ایک روز چھوڑ کر پھر گیا۔ جبار صاحب بھی ساتھ تھے۔ اُس وقت قدرے ہوش میں تھے۔ جبار صاحب (بیکن بکس والے) نے ٹیکہ لگایا اور میں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُداس و پژمردہ سا بیٹھا رہا۔ مجھے نہ صرف پہچان لیا بلکہ میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ آواز میں وہی استقامت اور حوصلہ مندی کا جذبہ موجود تھا۔ اپنے مرض کا ذکر بالکل نہ کیا اور ان کی زبان سے جو آخری الفاظ میں نے سنے وہ یہ تھے

''اشرف صاحب! میں improve کر رہا ہوں۔ بس چند روز میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ جبار صاحب نے بہت وفا کی ہے۔ میرا بہت خیال رکھا ہے۔''

دو روز بعد صبح نو دس بجے کے قریب ان کی چھوٹی صاحب زادی کا فون آیا کہ ''انکل! ابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔'' میرے منہ سے دفعتاً نکلا ''انا للہ وانا علیہ راجعون'' اور ریسور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اُن جیسا خوددار، عزتِ نفس کا حامل، مرنجاں مرنج، شریف الطبع، نیک خُو، خوش اطوار اور وضع دار انسان نہ دیکھا نہ سُنا۔ معجزۂ فن کبھی وقوع پذیر نہیں ہوتا جب تک کہ اُس میں عشق کی لگن شامل نہ ہو۔ مرزا ابنِ حنیف نے جس موضوع سے عشق کیا اُس کو ساری زندگی ایک سچے عاشق کی طرح محبوب رکھا۔ اُس میں اپنی ذات کو فنا کر لیا۔ اکملیت کے درجے تک پہنچے۔ اُس موضوع کی گہرائیوں کو چھو لیا اور تہہ تک پہنچ کر گوہرِ مقصود کو پایا۔ آثارِ قدیمہ اور دُنیا کے قدیم ترین ادب پر ان کی کتابیں بین الاقوامی شہرت کی حامل بنیں۔ بابل و نینوا، مصر اور پاک و ہند کی قدیم ترین تہذیبوں کو انہوں نے کھنگال ڈالا۔ جو کام ادارے نہ کر سکیں اُس کو ایک عاشق صادق نے کر دکھایا۔ دنیا کے قدیم ترین ادب پر ان کی ضخیم کتابیں، مصریات اور صنمیات پر ان کی تصنیفات بے مثال بھی ہیں اور بے بہا بھی۔ اپنے موضوع پر ان کو حیرت

انگیز دسترس حاصل تھی۔ حالات کو انہوں نے کبھی راستے کی دیوار نہ بننے دیا۔ کتابیں جہاں سے بھی اُنہیں ملیں حاصل کیں۔ کتابوں اور نوادرات کا ایک بے بہا ذخیرہ انہوں نے جمع کیا اور وفات سے پہلے یہ سارا خزانہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کو بِلا معاوضہ دے دیا۔ ایسا فیاض، ایسا دریا دل اور ایسا بے لوث انسان اس دور اس معاشرے میں کہاں ملتا ہے۔

اپنے موضوع کے سلسلے میں کتابوں کا حصول ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ لوگ کتابیں تو جمع کر لیتے ہیں لیکن ان کا مطالعہ کرنا ان کے مقصد اور مقدر میں نہیں ہوتا لیکن مرزا صاحب جو کتاب حاصل کرتے اس کا کماحقۂ مطالعہ کرتے اور اس مطالعے کا نچوڑ اپنی تصنیفات میں پیش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں آج حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ میں ترکی میں تھا تو مجھے کچھ کتابوں کی فہرست بھجوائی۔ میں نے ان کے نام تک کبھی نہ سنے تھے۔ اتفاق کی بات کہ انہی دنوں میرا انگلستان جانے کا پروگرام بن گیا۔ میں نے وہاں کتابوں کی مختلف دکانوں سے گھوم پھر کر دو تین کتابیں حاصل کر لیں۔ جب اگلے سال پاکستان آیا اور وہ کتابیں ان کی خدمت میں پیش کیں تو اس قدر خوش ہوئے کہ مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے مرزا صاحب سے معذرت کی کہ میں ان کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ نہ لا سکا تو فرمایا ''بھئی کتابوں سے بڑا تحفہ دنیا میں اور کیا ہو سکتا ہے۔'' پھر میں جب بھی ملتان آتا ان کے لیے آثارِ قدیمہ سے متعلق کوئی پتھر، کوئی پائیرس ضرور لاتا اور وہ بے حد خوش ہوتے۔ اس بار بھی ایک نمونہ خرید کر رکھا تھا لیکن وزن زیادہ ہونے کے سبب لا نہ سکا۔ شاید اب ان کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی، مجھے یاد ہے شمیم ترمذی صاحب تعلیم کے سلسلے میں غالباً آسٹریلیا گئے تھے تو ان سے بھی کتابوں کی فرمائش کی تھی اور وہ ان کے لیے لائے بھی تھے۔ اپنے موضوع سے عشق کی یہ کیفیت میں نے اور کسی شخص میں نہیں دیکھی۔

مرزا صاحب سے دوستی کا آغاز اُس وقت ہوا جب میں ۱۹۶۷ء میں بہاول نگر کالج سے تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج بوسن روڈ میں تعینات ہوا۔ اُس وقت وہ دانش کدہ کے نام سے کتابوں کی دکان کھولے ہوئے تھے۔ میں کئی بار ان کے دانش کدہ گیا۔ کتابوں کے شوقین اور لوگ بھی اس بک سٹال پر آتے۔ کتابیں دیکھتے بھالتے۔ لیکن میں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ مرزا صاحب نے کسی گاہک کی پذیرائی کی ہو یا اُسے کتابیں خریدنے پر مائل کیا ہو بلکہ حیرانی ہوتی کہ وہ بڑہ بے نیازی سے ایک کونے میں بیٹھے کتاب پڑھنے میں مگن رہتے۔ اگر کوئی صاحب کسی کتاب کے بارے میں پوچھتے تو مختصر سا جواب دے کر پھر مطالعے میں محو ہو جاتے۔ اُس دَور میں بڑے پہنچے کا پاجامہ کُرتا پہنتے تھے۔ سانولا سلونا رنگ، دُبلے پتلے، سیدھے سمارٹ انسان۔ دکاندار سے زیادہ ایک سکالر اور سنجیدہ مفکر دکھائی دیتے۔ ایسے بے نیاز شخص کی دکان کیسے چلتی۔ آخر مطلب کی کتابیں تو لے آئے باقی اِدھر اُدھر بانٹ دیں۔ اس سے پہلے کوئٹہ میں بھی مقیم رہ چکے تھے۔ وہاں پروفیسر خلیل صدیقی مرحوم سے تعارف ہوا اور ساری زندگی ان سے دوستی نبھائی۔ ملتان آئے تو چند ایک دوست بنائے اور پوری زندگی اُن کو محبت بانٹی۔ وہ دیر آشنا تھے لیکن جب

ایک بار دوست بنا لیتے تو جان قربان کرنے سے دریغ نہ کرتے۔

بُک شاپ کے بعد مرزا صاحب ''امروز'' کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ ملتان میں امروز کے ایڈیٹر مسعود اشعر تھے جو ایک پڑھے لکھے، روشن خیال، ادب دوست اور لبرل انسان ہیں۔ وہ ایسے ہی لوگوں کو امروز میں لائے۔ جب تک وہ ایڈیٹر رہے انہوں نے مرزا صاحب کی بے حد قدر کی۔ ان کے بعد خوش قسمتی سے اقبال ساغر صدیقی ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے بھی مرزا صاحب کی اہلیت، کارکردگی اور قابلیت کی بنا پر ان کا ہمیشہ احترام کیا اور بہت محبت دی۔

غالباً نواب سجاد حسین قریشی مرحوم کے عہد گورنری میں قلعہ ملتان کی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ سلیمی صاحب نے جو مرزا صاحب کے رفیق کار تھے، انہیں خبر کر دی۔ بس پھر تو دوپہر کے وقت سر پر بھیگا رومال رکھے دھوپ میں کھڑے رہتے۔ کھدائی کے دوران میں جو جو چیزیں برآمد ہوتیں ان کو اپنی نگرانی میں لیا، ان کی فہرست بنائی اور ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔

اُردو اکیڈمی کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے آتے۔ زبان و بیان کے معاملات میں اصغر علی شاہ اور آثار قدیمہ یا قدیم ترین تہذیبوں کے بارے میں بات ہوتی تو مرزا ابنِ حنیف سے رجوع کیا جاتا۔ وہ تفصیل سے ان موضوعات پر روشنی ڈالتے اور ان کی معلومات اور علمیت سب کے لیے حیرت کا باعث بنتی۔ احمد خان درانی مرحوم، جنہیں مرزا صاحب نے ''خان بابا'' کا خطاب دے رکھا تھا، کبھی کبھی مرزا صاحب کو ان کے جدِ امجد چنگیز خان کے حوالے سے چھیڑتے تو مرزا صاحب چنگیز خان کے اوصاف اس طرح گنواتے کہ ہم سب اُسے ایک ہیرو سمجھنے لگتے اور پھر اس دفاع کے بعد جب وہ خان بابا کے آبا میں سے احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے کے اقتصادی اور سیاسی نقصانات کی تفصیل بیان کرتے تو خان بابا کو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔ گویا تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

ترکی سے ہر سال میں دوستوں اور اپنے کنبے سے ملنے آتا تو دو ایک روز کے لیے لاہور ضرور جاتا۔ وہاں میرا قیام عموماً نیاز صاحب (سنگ میل پبلی کیشنز کے مالک) کے یہاں ہوتا۔ وہ ہمیشہ مجھے کہتے کہ ''مرزا صاحب کو سمجھاؤ وہ اپنی کتابیں مجھے دیں میں انہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔'' میں مرزا صاحب کے مزاج سے واقف تھا اس لیے رقم کی بات تو ان سے کہنے کی جرات نہ کرتا لیکن اشاروں اشاروں میں نیاز صاحب کی خواہش کا اظہار کر دیتا۔ ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ ''مجھے نہ تو پیسوں کی ضرورت ہے اور نہ نام و نمود کی۔ میں تو اپنے شوق کی تکمیل کر رہا ہوں اور بیکن بکس کے علاوہ کسی کو اپنی تصنیفات دینے کو تیار نہیں، اُن سے میرا وعدہ ہے اور میں یہ وعدہ نہیں توڑوں گا۔'' بیکن بکس نے بھی ان سے دوستی نبھائی۔ ان کی کتابیں اہتمام سے شائع کیں اور ان کا ہمیشہ خیال رکھا۔

جیسا کہ میں نے کہا مرزا ابنِ حنیف دیر آشنا تھے انہوں نے زندگی میں چند دوست بنائے لیکن ان سے ٹوٹ کر محبت کی۔ کسی کا گلہ سننا گوارا نہ کیا بلکہ دوستوں کے درمیان افہام و تفہیم قائم رکھنے میں

مرزا صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ ملتان سے باہر پروفیسر خلیل صدیقی مرحوم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ملتان سے احمد خان درانی مرحوم، عرش صدیقی مرحوم، ارشد ملتانی، اصغر علی شاہ، ڈاکٹر انوار احمد، مبارک احمد مجوکہ، اقبال ساغر صدیقی، فیاض تحسین اور راقم الحروف کو بہت عزیز رکھتے تھے اور یہ سب بھی مرزا صاحب پر جان چھڑکتے تھے۔

پروفیسر خلیل صدیقی مرحوم اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جب بھی ملتان آتے مرزا صاحب باصرار انہیں اپنے گھر لے جاتے۔ ہم سب کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ ہمارے پاس قیام کریں لیکن مرزا صاحب اس کی اجازت نہ دیتے۔ انوار صاحب کبھی کبھی خفیہ طور پر پروفیسر خلیل صدیقی کو ایئرپورٹ سے ہی ''اغوا'' کر کے لے جاتے لیکن مرزا صاحب کو جوں ہی خبر ملتی رکشا لے کر انوار صاحب کے گھر جاتے اور سامان اُٹھوا کر خلیل صدیقی کو ان سے چھین کر لے جاتے۔ فرمان صاحب تو مرزا صاحب کے علاوہ کسی کے ہاں قیام کی جرأت نہ کرتے۔

خلیل صدیقی اور فرمان فتح پوری کے ان کے یہاں قیام کا ایک فائدہ دوستوں کو براہِ راست یوں ہوتا کہ بھابھی صاحبہ کے ہاتھ کی پکی ہوئی لذیذ بریانی کھانے کو ملتی۔ بریانی بنانے میں مرزا صاحب کی بیگم صاحبہ کو یدطولیٰ حاصل ہے اور دونوں حضرات کے قیام کے دوران بریانی ضرور ملتی۔ مرزا صاحب خود بہت تھوڑا کھاتے۔ دوستوں کو البتہ باصرار کھلاتے اور خوش ہوتے۔ میرے یہاں جب بھی آتے بس چائے کا ایک کپ پیتے، مٹھائی بسکٹ، شامی کباب وغیرہ کو ہاتھ تک نہ لگاتے، یہی صورت دوسرے دوستوں کے یہاں ہوتی۔

مرزا ابنِ حنیف کے برادرِ نسبتی اقبال صاحب امریکہ میں مقیم ہیں۔ وہ مرزا صاحب کے قریبی عزیز ہونے کے ناطے سے ہی نہیں بلکہ ان کی شرافت، علمیت، سادگی، درویشی اور محبت وخلوص کے سبب سے ہمیشہ ان کے بے حد مداح اور گرویدہ رہے۔ میں ان سے مرزا صاحب کی وفات پر پہلی بار ملا۔ وہ واقعی اپنے بہنوئی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ان کے بارے میں باتیں کرتے ان کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ ایسے پیار کرنے والے عزیز بھی ان کو ملتے ہیں جو خود پیار کرنا جانتے ہوں۔

اقبال صاحب کو اس بات کا افسوس تھا کہ بعض دوستوں نے مرزا صاحب پر لکھتے ہوئے ان کے مصائب کا ذکر شدومد سے کیا جب کہ حقیقت یہ نہ تھی۔ مرزا صاحب سادہ مزاج اور درویش صفت انسان ضرور تھے لیکن ان کی اقتصادی حالت ایسی دگرگوں نہ تھی کہ ان کے بارے میں ہمدردی کے جذبات اُبھارے جائیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے بھی اور بعض اداروں کی طرف سے بھی مرزا صاحب کو بیماری کے دوران چیک بھجوائے گئے جو ان کی خوددار طبیعت نے قبول نہ کیے اور چیک واپس کر دیئے۔ ڈاکٹر انوار احمد کا کہنا ہے کہ ''اکادمی ادبیات نے دورانِ علالت دو چیک مرزا صاحب کے لیے بھیجے جو انہوں نے واپس کر دیئے۔ ان میں سے ایک چیک میں نے مرزا صاحب کی بیوی کے نام بنوایا لیکن جب

انہیں معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے گھر بلا کر ڈانٹا اور چیک بھی واپس کر دیا۔'' (بحوالہ ''خبریں''، ۱۳؍اگست، ۲۰۰۴ء)۔

مرزا صاحب کی وفات کے بعد ایک آدھ روز کے لیے مجھے لاہور جانا پڑا۔ سنگ میل پبلی کیشنز کے یہاں بیٹھا تھا کہ مستنصر حسین تارڑ تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں پوچھا ''مرزا ابنِ حنیف کا کیا حال ہے؟'' میں نے بتایا کہ وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بے حد ملول اور افسردہ ہوئے۔ کہنے لگے ''میں جب بہاؤ لکھ رہا تھا تو ملتان جانا ہوا۔ دوستوں سے فرمائش کر کے مرزا ابنِ حنیف سے ملاقات کی اور اُن سے اپنے موضوع کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے اس قدر تحقیقاتی مواد دیا کہ اُس کو میں نے اپنی کتاب میں برتا اور میری یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی۔'' پھر کہنے لگے ''مرزا صاحب چھوٹے شہر کے بہت بڑے انسان تھے۔''

زکریا یونیورسٹی میں سرائیکی ریسرچ سنٹر وجود میں آیا تو اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر انوار احمد نے مرزا صاحب کی خدمات اس سنٹر کے لیے حاصل کیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے سکالر بھی تعینات کرائے ان میں شبیر حسن اختر اور حنیف چوہدری کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ یہ تینوں سکالر امروز سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ انتخاب میرٹ پر کیا۔ ان کے بقول ''سرائیکی سنٹر کے لیے انہوں نے (مرزا ابنِ حنیف) گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس ادارے کے اندر ان کی مہک تا دیر موجود رہے گی۔'' (خبریں)

افسوس کہ مرزا صاحب جلد ہم سے رخصت ہو گئے اور سرائیکی سنٹر کو ناقابلِ تلافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مرزا صاحب پر ایم اے کی سطح پر مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ یونیورسٹیوں میں زندہ لوگوں پر ڈاکٹریٹ کی اجازت نہیں ہے۔ مرزا صاحب کے سلسلے میں یہ قدغن اب باقی نہیں رہی۔ ان کا کام اس لائق ہے کہ ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جائے۔

مرزا ابنِ حنیف مشرقی پنجاب کے ضلع حصار میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد نقل مکانی کر کے ملتان آ گئے۔ کچھ عرصہ کوئٹہ میں بھی گزارا لیکن ملتان کی قدامت اور تاریخی اہمیت انہیں مستقل طور پر یہاں کھینچ کر لائی اور پھر عرش صدیقی مرحوم کی طرح وہ بھی ملتان کے ہو کر رہ گئے۔ لگتا ہے دونوں کا خمیر ملتانی مٹی سے اُٹھا تھا اور دونوں ملتانی مٹی ہی میں دفن ہوئے۔ کسی شہر کو ایسے وفادار اور محبت کرنے والے فرزند روز روز کہاں ملتے ہیں۔ ملتان کی سرزمین کو اپنے ان نامور فرزندوں پر ناز ہے اور رہے گا۔

☆☆☆

غلام حسین ساجد

آنکھیں ساتھ چلی جاتی ہیں

۲۹ر جولائی ۲۰۰۴ء کو صبح سات بج کر ستاون منٹ اور چھ سکینڈ پر سیّد عامر سہیل نے ایس ایم ایس کے ذریعے مرزا ابنِ حنیف کی رحلت کی خبر دی تو ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو، اپنے وجود سے الگ، ایک اور ہی مقام پر پایا۔ معلوم نہیں یہ کون سی کیفیت تھی مگر ذرا سی دیر میں میرا دل لہو سے بھر گیا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے حالانکہ مرزا ابنِ حنیف، جو اپنے سے پہلے مرزا لکھنے اور کہنے کی بہ تاکید ممانعت فرماتے تھے، سے اپنے بیس برس کی یاد اللہ کو مَیں نے کبھی نیاز مندی کے درجے سے اوپر لے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور اُنہی کی طرح معاملات میں اپنے آپ کو ہر طرح کی جذباتیت سے پاک رکھنے کی کوشش کی تھی۔

مرزا ابنِ حنیف کا نام تو مَیں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بھی سُنا تھا۔ ملتان میں ایک آدھ بار کسی محفل میں اُن کی زیارت بھی ہوئی تھی مگر اُن سے باقاعدہ تعارف مرکز تحقیق و ترقی نصاب۔ لاہور کی ملازمت کے دوران میں اُن کی کتاب ''دنیا کا قدیم ترین ادب'' کے ذریعے ہوا۔ علم الآثار، اصنام پرستی اور قدیم تہذیبوں سے موجود کی طرف سفر کرتی اساطیری روایت کی خوشبو اور بصیرت سے بھری اس کتاب سے پہلے میں سیّد سبطِ حسن کی تالیف ''ماضی کے مزار'' پڑھ چکا تھا اور ماضی کے اسرار، شفاف حیرت اور بے ریا دانش سے یک گونہ تعلق محسوس کرنے لگا تھا۔ یہی نہیں مَیں نے اپنی شاعری کی انفرادیت کو پروان چڑھانے کی خاطر نسلِ آدم کے بچپن کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا اور مَیں یہ جاننے کا متمنی تھا کہ فطرت سے براہِ راست تعلق اور تصادم کے اوّلین دَور میں انسان نے اپنے آپ کو کس طرح اپنے قدموں پر کھڑا رکھنے کی سعی کی ہے اور اپنے موجود کی ہیبت اور جبروت کو کن لفظوں میں بیان کیا ہے۔

''دنیا کا قدیم ترین ادب'' میرے لیے اِسی سری کائنات کے مکاشفے کی کلید بن کر آئی۔ اِسی کتاب نے جو مجھے اب بھی محبوب ہے، مجھ پر اِس امر کو واضح کیا کہ اب تک کے تہذیبی سفر میں، ایک بہتر اور آسودہ زندگی کی تلاش میں ہم نے کیا کچھ کھویا اور پایا ہے۔ سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کرنے کی آرزو میں ہم کس قیامت کے شور اور وسوسے سے دوچار ہیں اور ہمارے اندر، ہماری ازلی بغاوت کا دائرہ سمٹ کر کس طرح ایک نقطے میں سمانے کو بے چین ہے۔ ہم کیسے اور کس طرح کے بالشتئے بن گئے ہیں اور کیوں کر اپنی شمعِ حیات کو دونوں طرف سے جلا کر معدوم کرنے کی کوشش میں ہیں۔

ابھی مَیں نے ''دنیا کا قدیم ترین ادب'' کا مطالعۂ مکمل نہیں کیا تھا کہ کہیں سے مرزا صاحب کی دو اور کتابیں ''بھولی بسری کہانیاں'' اور ''ہزاروں سال پہلے'' میرے ہاتھ لگ گئیں۔ ان دونوں

کتابوں کو مَیں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا تو مجھے اُن کی اور کتابوں کی تلاش رہنے لگی۔ اِس لیے کہ قدیم تہذیبوں کے ادب، مصوری، اساطیر اور دانش سے آگاہی کے لیے، اردو زبان میں اُن سے پہلے اور بعد میں کوئی اور وسیلہ میرے علم میں نہ تھا اور انگریزی میں شائع ہونے والی کتابیں، نایاب اور گراں قیمت ہونے کے باعث میری دسترس سے باہر تھیں۔

یہاں اِس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ مجھے انگریزی پڑھنے کی عادت اب تک نہیں ہو پائی اور اگر بدقسمتی سے مجھے انگریزی میں شائع ہونے والی کسی کتاب کو پڑھنا پڑ جائے تو اپنی محدود استعداد کے باعث کتاب ختم ہو جانے تک میرے منہ کا ذائقہ کڑوا اور روح پر عجیب بوجھ سا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ جیسے میں پھولوں کی خوشبو سے لُطف اندوز ہونے کے بجائے انہیں چبانے میں لگا ہوں۔ مجھے اصرار ہے کہ میرے دل پر دستک دینے کے لیے ہر کتاب کو میری مادری زبان میں شائع ہونا چاہیے، کسی بدیسی اور اکتسابی زبان میں نہیں۔ گو اردو بھی میرے لیے ایک اکتسابی زبان ہی ہے مگر اس سے میری شناسائی اِس مرحلے پر آ پہنچی ہے کہ اُسے میں باآسانی اپنی دوسری مادری زبان کا درجہ دے دوں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

میں مرزا صاحب کی کتابوں کی کھوج میں رہا۔ اس لیے بھی کہ اب میری غزل نے سرّی مکاشفوں اور تہذیبی اساطیر سے ناتہ جوڑ لیا تھا اور مَیں اپنی شناخت کے سفر میں اپنے ماضی، اپنی روایت اور تمدنی وراثت سے آگاہ رہنا ضروری جانتا تھا اور اس لیے بھی کہ سائنسی حقائق کی دنیا سے اُوبھ کر ذہنِ انسانی کے بچپن کی طرف دیکھنا ایک الگ ہی مزہ دیتا تھا۔ کوئی ہے، جسے اپنے بچپن کی طرف پلٹ کر دیکھنا خوش نہ آتا ہو؟

مرزا صاحب پہلے آدمی تھے جو میری آسودگی کا باعث ہو سکتے تھے۔ اُن کی اُفتادِ طبع اور صنمیات، مصریات اور علم الآثار سے اُن کی دلچسپی کی بنیاد کیا تھی، یہ جاننا محققین کا کام ہے۔ میرے لیے تو وہ ہمارے اجتماعی حافظے اور مشترک ماضی کی طرف کھلنے والا اکلوتا دروازہ تھے اور مَیں اِس دروازے کو بند کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اُنہی دِنوں مجھے مدینۃ الاولیا، ملتان سے حضوری کا بلاوا آ گیا اور میں اگلے تیرہ برس اور ڈھائی مہینوں کے لیے یہاں کی رُتوں، رسوم اور ادیبوں سے ہم کلام ہونے کو ۲ر مئی ۱۹۸۴ء کو ملتان جا پہنچا۔ مرزا ابنِ حنیف بھی ملتان کی سوغاتوں میں سے ایک تھے۔ پھر مَیں اُن سے کس طرح دُور رہ سکتا تھا؟

ملتان ہجرت کرنے کے چند روز بعد ہی مَیں انہیں ''امروز'' اخبار کے دفتر میں جا کر ملا۔ اُنہیں ملنے کی تمنا ڈاکٹر محمد امین کے ساتھ اپنی کتاب ''موسم'' کی کتابت کے لیے ''امروز'' کے خوش نویس طالب حسین سے ملاقات کے لیے جانے پر پوری ہوئی۔ مجھے مرزا صاحب کو پہنچاننے میں دقّت اس لیے نہیں ہوئی کہ مرزا صاحب کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنے شعری سفر کے آغاز پر، دو ایک بار دیکھنے کا شرف حاصل تھا، جب میں خادم رزمی اور ساغر مشہدی کی مصاحبت میں بن بلائے، آس پاس کی شعری نشستوں میں جا نکلتا تھا۔ ارشد ملتانی صاحب، عرش صدیقی، اصغر ندیم سیّد اور حضرت عابد عمیق سے تعارف کا زمانہ یہی تو تھا اور ہاں! ہائیکو کے امام پروفیسر محمد امین سے تعلقِ خاطر پیدا ہونے کا بھی۔

مرزا صاحب کو مَیں نے دس بارہ برس کے بعد دیکھا تو مجھے اُن میں اور اُس وقت کے مرزا صاحب میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ اگرچہ یہ ملاقات سرسری اور تکلّف کا رنگ لیے تھی مگر ایک دائمی تعلق کی بنیاد بننے کے لیے کافی تھی۔ مری خوش قسمتی سے اُسی دن شام کو ایک کتابوں کی دکان پر پھر سامان ہو گیا۔ دکاندار نے ہمیں چائے پر مدعو کیا تو گفتگو کا سلسلہ چل نکلا اور مرزا صاحب یہ جان کر کہ اردو غزل میں قدیم تہذیبوں کی طرف دیکھنے اور تہذیبی ورثے اور اساطیر کو علامتی سطح پر برتنے کا کام آغاز ہو گیا ہے، بہت خوش ہوئے اور وہ اگلی شام کو اپنے گھر پر ملاقات کا وقت اور دعوت دے کر رخصت ہوئے تو مرے دل کی مُراد بر آئی۔

مرزا صاحب سے اُن کے گھر پر ہونے والی ملاقاتوں کی تعداد زیادہ نہیں اور اِس میں سدِ راہ میرا یہ احساس تھا کہ اِس نوع کی ملاقاتیں اُن کے کام کا ہرج کرتی ہیں۔ وہ ایک عدیم الفرصت اور بہت سے میگا پراجیکٹس میں اُلجھے ہوئے شخص تھے اور اِس بنا پر اُنہوں نے اپنے وقت کی خاص تقسیم کر رکھی تھی۔ دفتر سے گھر آنے کے بعد وہ شام کو کچھ دیر کے لیے بیکن بکس کا رُخ کرتے تھے، جو اُن کی بہت سی ضخیم کتابوں کے ناشر بننے والے تھے۔ بیکن بکس پر موجود ادیبوں سے دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد وہ گھر کا رُخ کرتے تھے اور رات کا کھانا کھا کر کام میں جُت جاتے تھے۔ ایک ملاقات میں، اُنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کئی برس سے اُن کا یہی معمول ہے اور ملتان میں موجودگی پر اُن کی کوئی ایک رات بھی ایسی نہیں گزری، جب دیر تک مطالعہ کرنے کے بعد وہ کچھ لکھے بغیر سو گئے ہوں۔ ہاں! ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے آنے اور اُن کی طرف مقیم ہونے پر اِس تسلسل میں کوئی رخنہ، کبھی پیدا ہوا ہو تو مجھے اِس کا علم نہیں۔ اُنہوں نے مجھے کسی بھی دن عصر کے بعد اپنے گھر پر حاضر ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔ مگر مَیں جان بوجھ کر اِس سہولت سے فائدہ نہیں اُٹھاتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اُنہیں آرام کا موقع دے کر شام کو اُن سے بیکن بکس پر ہی ملاقات کر لوں کہ جہاں میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک مدّت تک نشست جماتا رہا ہوں۔

مرزا صاحب کے گھر پر ملاقات کے لیے جانے میں ایک رُکاوٹ، اُن کے ڈرائنگ روم میں آویزاں کسی فرعون کی فریم شدہ ایک تصویر بھی تھی۔ اِس تصویر میں (جو کسی بت یا ممی کی ہے) صاحبِ تصویر کے ہونٹوں پر ایک کم نُما تبسم کی لکیر کھنچی ہے، جسے غور سے دیکھا جائے تو وہ مسلسل پھیلتی اور سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ پہلی بار مَیں نے مرزا صاحب کے توجہ دلانے پر اِس کیفیت کو محسوس کیا تھا اور بعد ازاں، مَیں جب بھی چند لمحوں کے لیے اِس کمرے میں اکیلا ہوتا یہ تصویر مجھے اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی تھی اور مری مشکل یہ تھی کہ مرزا صاحب کے انتظار میں یا اُن کے چائے/شربت لانے کو اندر چلے جانے پر اور کبھی کسی اور کام سے گھر میں بلا لینے پر، مجھے ہر ملاقات میں کچھ دیر اِس تصویر کے ساتھ اکیلا رہنا ہی پڑتا تھا۔ سو مَیں اُن سے، اُن کے گھر پر ملاقات سے کترانے لگا تھا اور اُن کے گھر پر ملاقات میں میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ باہر دروازے کے پاس ہی لان میں دو کرسیاں ڈال کر نشست جما لیں۔ گارڈینیا کی باڑ نے اِس نوع کی نشست کے لیے سہولت پیدا کر رکھی تھی اور مجھے کھلے میں بیٹھنے پر اِصرار بھی رہتا تھا۔ اس لیے آخر آخر میں مرزا صاحب نے اندر ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھنے پر اصرار کرنا ترک کر دیا تھا۔ شاید وہ کسی وسیلے سے میرے خوف سے آگاہ ہو گئے ہوں یا مرے گریز کو، مرے انکسار کا ایک حصہ سمجھ کر مجبور ہو گئے ہوں۔

اپنے لاہور کے قیام کے دوران میں مَیں نے مرزا صاحب کی جن کتابوں کا مطالعہ کیا تھا وہ مرکزِ تحقیق و ترقی نصاب کی لائبریری کی تھیں یا پروفیسر علی عباس جلالپوری کے علمی اثاثے کی ایک کڑی۔ ملتان جانے کے بعد مَیں نے اُن کی چار کتابیں ''ہزاروں سال پہلے''، ''دنیا کا قدیم ترین ادب''، ''مصر کی قدیم مصوری'' اور ''سات دریاؤں کی سرزمین'' مختلف اوقات میں خریدیں اور پہلی بار ایک خاص طرح کی ذاتی دلچسپی مگر ناقدانہ نقطۂ نظر کے ساتھ اُن کا بغور مطالعہ کیا۔ میرا اِرادہ اُن پر کچھ لکھنے کا تھا مگر مرزا صاحب کی درویشی اور درویشی سے زیادہ جلالی طبیعت کی زد میں آنے کے خوف نے مجھے اِس جسارت سے باز رکھا۔ اُن کی کتابوں کے بارِ دگر مطالعے سے مَیں نے محسوس کیا کہ طول بیانی اور بے جا وضاحت اُن کے اُسلوب کی ایک بڑی خامی ہے۔ وہ دو سطروں میں کہی جانے والی بات کو ایک اَن تھک شارح کی طرح دو صفحوں میں کہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اِس کوشش میں بعض اوقات تکرارِ معنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پنجابی محاورے کے مطابق وہ ''موضوع کے دودھ کو لسی'' بنا کر رکھ دیتے ہیں اور ایک خاص طرح کی لہک اور مستی کا شکار ہو کر ماضی کے اسرار اور ورثے کو ہر ہر پہلو سے نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس پر مستزاد یہ کہ وہ عموماً اپنی کتابوں کے ماخذ کا ذکر نہیں کرتے اور جن کتابوں کے آخر میں کتابیات درج کی ہے۔ اُن کتابوں کے متن بھی، اُن کتابوں سے اپنے استفادے کا اعتراف موضوعی حوالوں کی صورت میں کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ اُن کی تمام کتب اُن کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہیں اور وہ کسی موضوع پر خوشہ چینی کے مرتکب نہیں ہوئے۔

مرزا صاحب کی ایک اور عادت موضوع کو پلٹ پلٹ کر دیکھیے اور اس میں اضافہ کرتے رہنے کی بھی تھی۔ اِس کی ایک مثال اُن کی بعد میں شائع ہونے والی تین کتابیں ''مصر''، ''بھارت'' اور ''یونان'' ہیں جو پہلے ایک پُرلطف اور معقول ضخامت کی کتاب ''بھولی بسری کہانیاں'' کا روپ لیے تھی۔ اہنوں نے طویل مباحث، موضوعی تکرار اور بے جا طوالت سے اِس کتاب کو دو ہزار صفحوں پر پھیلا دیا تو اُن کا اعجاز اور تاثیر جاتی رہی اور وہ قاری کے صبر اور اخلاق کے لیے ایک امتحان بن کر رہ گئیں۔ مَیں نے بعض اوقات رمز اور کنایے کا سہارا لے کر یہ بات اُن کے گوش گزار کرنے کی کوشش بھی کی مگر تحریری شکل میں اپنے تحفظات کو اُن کے رُوبرو رکھنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا کیونکہ اُس وقت تک مرزا صاحب مجھے پسند کرنے لگے تھے۔ غالباً شاعروں میں مَیں اُن کی اُکلوتی پسند تھا اور اِس پسندیدگی کی ایک وجہ محمد سلیم الرحمٰن اور احمد ندیم قاسمی سے ہم دونوں کی باہمی عقیدت بھی تھی۔

مجھ سے مرزا صاحب نے احمد ندیم قاسمی صاحب کا جب بھی ذکر کیا، عقیدت اور احسان کے لہجے میں کیا۔ فرماتے تھے کہ قاسمی صاحب نے اُن کے مضامین اولاً ''امروز'' میں شائع کیے تھے اور اُس کام کو جاری رکھنے کے لیے اُن کی مسلسل حوصلہ افزائی کی تھی۔ بڑے آدمی کی ایک پہنچان یہ بھی ہے کہ وہ

چھوٹے سے چھوٹے احسان کو یاد رکھتا ہے۔ اِس حوالے سے مجھے مرزا صاحب سے بڑا آدمی آج تک کوئی نہیں ملا کیوں کہ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی ذات پر احسان کرنے والے ہر شخص کے شکر گزار تھے اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ اِس امر کا اظہار کرتے تھے، خواہ اُس سے اُن کی اپنی تحقیر کا پہلو ہی کیوں نہ نکلتا ہو۔ محمد سلیم الرحمٰن سے اُن کی محبت کی بنیاد محمد سلیم الرحمٰن کے تراجم تھے۔ اِس عقیدت میں چوکھا رنگ تب آیا، جب محمد سلیم الرحمٰن کی تالیف ''مشاہیرِ ادب'' (یونانی-قدیم دَور) شائع ہوئی اور اس ناچیز کے توسط سے ملتان پہنچی۔ مرزا ابنِ حنیف اِس کتاب کے بے حد مداح تھے اور اُن کے خیال میں یہ ایک کتاب ہی محمد سلیم الرحمٰن کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ مَیں نے مرزا صاحب کے بارے میں سُن رکھا تھا (اور اس بات میں صداقت بھی تھی) کہ وہ اپنی کوئی کتاب کسی کو تحفے میں دیتے ہیں نہ ہی کسی سے قیمت ادا کیے بغیر کتاب کا تحفہ قبول کرتے ہیں۔ وہ صرف اور صرف کتاب کو خرید کر پڑھنے کے قائل ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ اُنہوں نے شاعری سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود، اساطیری حوالوں کی موجودگی کے باعث قیامِ ملتان کے دوران میں شائع ہونے والی میری دو کتابیں ''موسم'' اور ''عناصر'' میری طرف سے کتاب پیش کرنے کے عندیے کے باوجود خریدی تھیں اور میرے پاس موجود اُن کی سبھی کتابیں بھی میری اپنی خرید ہیں مگر محمد سلیم الرحمٰن کے لیے اُنہوں نے مجھے اپنی کتاب ''دنیا کا قدیم ترین ادب'' (دو جلدیں) کا تازہ ایڈیشن تحفے میں دینے کو بھجوایا تھا اور اِس کتاب کے سلیم تک پہنچنے کے بعد ہر دو حضرات میں خطوط کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔

مرزا صاحب کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اوّل و آخر ایک نثر نگار اور محقق تھے۔ پھر بھی اُنہوں نے ''موسم'' اور ''عناصر'' کو خرید کر پڑھا اور میری حوصلہ افزائی کے لیے تعریفی کلمات بھی کہے بلکہ ''عناصر'' کے لیے تو اُنہوں نے حواشی اور تعلیقات بھی لکھے تھے۔ اس قصے کی تفصیل یہ ہے کہ ''عناصر'' پر کام کرنے کے دوران میں مَیں اُن سے مسلسل رابطے میں تھا۔ کتاب مکمل ہونے پر اُنہوں نے کتاب میں استعمال ہونے والے اساطیری حوالے/ علامتوں کی کتاب کے آخر میں نثری وضاحت شائع کرنے کی تجویز دی تو مَیں نے بلا توقف کیے، اِس کام کو اُنہی کے سپرد کر دیا۔ مرزا صاحب بخوشی آمادہ ہو گئے اور ایک ہی رات میں کتاب کا مسودہ دیکھ کر تمام اہم اساطیری علامتوں/ حوالوں پر، کوئی بیس صفحات پر محیط تفصیلات لکھ دیں جو مَیں نے مسودے کے ساتھ کتاب کے لیے ناشر کو بھجوا دیں مگر بیکن بکس کے جبار صاحب (جو اُس وقت اِس کتاب کو شائع کرنے والے تھے) کی غفلت اور عدم دلچسپی کے باعث، سرورق کے سوا سبھی کچھ گم ہو گیا اور یوں کتاب کو لاہور سے مرزا صاحب کی فراہم کردہ وضاحت کے بغیر شائع کرنا پڑا۔ مرزا صاحب نے کتاب کا یہ ایڈیشن خرید کر پڑھا مگر مجھ سے آخری ملاقات ہونے تک، ایک بار اشارے سے بھی کبھی یہ نہیں پوچھا کہ ان کے لکھے حواشی/تعلیقات کتاب میں شامل کیوں نہیں ہو پائے۔ ان کے گزر جانے پر مجھے اب یہ دھیان آتا ہے کہ اُن کے سے قد و قامت کے شخص کو ایسا سوال کرنا ہی

نہیں چاہیے تھا۔ وہ تعلیقات اُن کا دان تھے اور دان دینے والے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کرتے کہ اُن کے دیے دان کو کس طرح استعمال میں لایا گیا۔ لایا گیا بھی یا نہیں؟

مرزا صاحب اپنی کتابیں کسی کو پیش نہیں کرتے تھے۔ اس لیے بہت کم لوگ ہوں گے، جن کے پاس اُن کی کوئی دستخط شدہ کتاب ہوگی۔ مَیں نے ایک دو بار، اُن کو اُس وقت تک، میرے پاس موجود کتابوں پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا تو اُنہوں نے اِسے واقعے کی وضاحت کے لیے بہت پُر لطف طریقہ اختیار کیا، لکھتے ہیں:

''غلام حسین ساجد جو مرے خیال میں اردو شاعری میں عراق و مصر کے صنمیاتی اور مذہبی حوالے استعمال کرنے میں پہل کر رہے ہیں، کے پُر زور اصرار پر۔''

(کتاب: ''مصر کی قدیم مصوری'' بتاریخ ۱۵/مارچ ۱۹۸۵ء)

''یہ دستخط مَیں اپنی طبیعت پر جبر کر کے دے رہا ہوں۔''

(کتاب: ''ہزاروں سال پہلے'' بتاریخ ۲۷/ستمبر ۱۹۸۶ء)

''غلام حسین ساجد صاحب صریحاً جبر فرما رہے ہیں اور مَیں بطورِ احتجاج میں دستخط دے رہا ہوں۔''

(کتاب: ''سات دریاؤں کی سرزمین''، بتاریخ ۲۷/ستمبر ۱۹۸۶ء)

''محترم غلام حسین ساجد نے یہ دستخط زبرستی لیے ہیں۔''

(کتاب: ''دنیا کا قدیم ترین ادب'' بتاریخ ۲۷/ستمبر ۱۹۸۶ء)

چلیے زبردستی سہی مگر اُنہوں نے دستخط دیے تو اور کیا یہ بات قابلِ ذکر نہیں کہ اُنہوں نے مجھے زبردستی کرنے کے لائق جانا تو۔ اب افسوس ہو رہا ہے کہ مَیں نے اپنے پاس موجود اُن کی کچھ اور کتابوں پر زبردستی کر کے اُن کے دستخط کیوں نہ لے لیے؟ اگر مَیں نے ایسا کیا ہوتا تو میرے پاس موجود اُن کی سبھی کتابیں یادگار بن جاتیں۔

مَیں مرزا صاحب کی طرف بیسیوں بار گیا ہوں گا مگر وہ میرے یہاں صرف تین بار تشریف لائے۔ ایک بار ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی آمد اور میری طلبی کی نوید لے کر (اور اچھا ہوا کہ اُس زمانے میں میرے یہاں فون نہیں تھا ورنہ وہ خود آنے کی زحمت کیوں کرتے؟) دوسری بار مستنصر حسین تارڑ کے اپنے یہاں آنے کی اطلاع کرنے اور تیسری بار میرے گھر پر برپا ہونے والی ایک دعوت میں شرکت کرنے کی خاطر۔ مرے غریب خانے پر ملتان کے سبھی لکھنے والے ایک آدھ مرتبہ ضرور آئے ہوں گے اور مجھے اُن کے آنے پر خوشی بھی ہوتی تھی۔ ایسی خوشی جو ایک اچھے دوست کے تشریف لانے پر ہوتی ہے مگر مرزا صاحب کی آمد ایک واقعہ تھی۔ وہ جب کبھی آئے پیدل پا آئے اور مرے سواری پر گھر پہنچا دینے کی آفر اور اصرار کے باوجود پیدل چل کر واپس بھی گئے۔ ملتان کے دو ادیب، ڈاکٹر اَسد اریب اور مرزا ابنِ حنیف ایسے ہیں جو کبھی مرے موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھے۔ اوّل الذکر تکلّف، اَنا پرستی اور اپنی خاص اُفتادِ طبع

کے باعث اور موخر الذکر عجز، سادہ دلی اور ذات مستی کی وجہ سے۔ پھر بھی، جب کبھی وہ راستے میں ملتے تھے، میں رُک کر اُنھیں سوار ہونے کو کہتا تھا اور وہ ہنس کر ٹال جاتے تھے، تاہم مرے قیامِ ملتان کے آخری دنوں میں وہ صریحاً انکار کرنے یا ٹالنے کے بجائے اپنی کمر درد کا عذر پیش کرنے لگے تھے اور مَیں جانتا تھا کہ اُن کی اِس بات میں صداقت بھی ہے۔ اگر مَیں نے قیامِ ملتان کے دوران میں کار خریدی ہوتی تو اُنھیں شاید مری رفاقت سے انکار نہ ہوتا۔

مرزا صاحب، جس کسی نوجوان میں کام کرنے کی لگن اور ہُنر وَری کی چمک دیکھتے تھے۔ اُس سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ مَیں نے تنقید لکھنی آغاز کی تو پہلی داد اُنھیں سے ملی بلکہ اُنھیں گمان تھا کہ اردو شاعری میں ضمیات اور اساطیری علامتوں کی تفہیم کے کام کے لیے اِس احقر سے موزوں کوئی اور شخص ہو نہیں سکتا۔ اُن کو اِصرار تھا کہ مجھے نثر کا ایک صفحہ روز لکھنا چاہیے خواہ بعد میں اُسے جلا ہی کیوں نہ دیا جائے۔ شاید وہ اس طرح مرے اندر کے کاہل، نیند کے ماتے شخص کو کام پر لگانے کی کوشش میں تھے مگر مَیں نے اُن کی بات کو مان کر نہیں دیا۔ شاید اِس کی ایک وجہ یہ ہو کہ مَیں اساطیری غزل کی تفہیم اور نظریہ سازی کے کام کے لیے اپنے آپ کو اہل نہیں جانتا تھا اور مجھے یہ گمان تھا کہ ہمارے عہد کے معروف ناقد، ایک نہ ایک دن، از خود اِس نئے لہجہ اور اُسلوب کی جانب متوجہ ہوں گے مگر اب جا کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہر نیا راستہ نکالنے والے کو، اُس راستے کی مشکلات اور عجائب کے بارے میں خود ہی بتانا آغاز کرنا چاہیے۔ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا اب صرف ایک ہی طریقہ بچا ہے اور وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ شور مچا کر سب کو اپنی طرف نگراں ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔

مرزا صاحب وقت کے بے حد پابند تھے۔ یہ خوبی یا خامی کسی حد تک مجھ میں بھی ہے۔ اس لیے اُن سے جہاں اور جب بھی ملاقات طے پائی۔ طرفین کو مایوسی نہیں ہوئی۔ وہ میری پابندیٔ وقت کی عادت سے خوش رہے اور خود اُنھوں نے اپنے بتائے ہوئے وقت پر دستیاب ہونے کا ہمیشہ دھیان رکھا۔ اُن کی بڑی صاحبزادی کی شادی پر مجھ سمیت بہت کم لوگ طے شدہ وقت پر تقریب میں پہنچ پائے تھے مگر اُنھوں نے دعوت نامے پر لکھے وقت کے مطابق کھانا کھلا کر بیٹی کو سسرال روانہ کیا اور بچ جانے والا بے تحاشا کھانا درویشوں اور راہ گیروں میں بانٹ دیا۔ اس شادی پر مَیں اُن کی صاحبزادی کے لیے تحفہ لے کر گیا تو اُنھوں نے سختی سے منع فرما دیا اور مرے اصرار اور روٹھ جانے کی دھمکی کے باوجود اپنے فیصلے کو تبدیل نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو مجھے اُن کے ابنِ حنیف ہونے میں شک رہتا!

اُنھوں نے اپنی کسی کتاب پر ''مرزا ابنِ حنیف'' نہیں لکھا۔ بالمشافہ گفتگو میں ''مرزا ابنِ حنیف'' کہنے پر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ اُنھوں نے ایک سے زیادہ بار کہا کہ مَیں صرف اور صرف ''ابنِ حنیف'' ہوں مگر نہ معلوم کیوں، مجھ سمیت، اُن کے سبھی چاہنے والے، اُن کو مرزا صاحب کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ ملتان میں صرف ''مرزا صاحب'' کہنے سے ''ابنِ حنیف'' ہی مُراد ہوا کرتے تھے اور اب یہ چند سطور لکھتے ہوئے بھی، مَیں چاہ کر بھی اپنے آپ کو مرزا ابنِ حنیف کہنے سے باز نہیں رکھ

پایا۔ مجھے معلوم ہے، اِس کا سبب وہ احترام ہے جو اُن کی معتدل مزاجی، شرافت اور منصفانہ روّیے کے باعث اُن کے ہر شناسا کے دل میں موجود ہے اور رہے گا۔

مرزا صاحب تجربے کے قائل تھے اور حقائق کو کسی بنیاد پر ہی تسلیم کرتے تھے۔ ایک بار، ایک سنیاسی کے دعوے پر کہ سانپ کے دانت کھٹے کر دیئے جائیں تو وہ ڈس نہیں پاتا۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو کلائی پر ڈسوا لیا تھا اور بڑی مشکل سے بچے تھے مگر مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے وہ اِس پر خوش تھے کہ اُنھوں نے سنیاسی کو جھوٹا کر دکھایا تھا۔

مرزا صاحب نے کبھی سانپ نہیں پالا، نہ ہی اُنھیں آستین کے سانپوں سے واسطہ پڑا مگر وہ سانپ سے یک گونہ اُنس رکھتے تھے اور ''مار پرستی'' کے موضوع پر ایک عظیم الشان منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ یہ کام کہاں تک پہنچا، مجھے خبر نہیں مگر وہ چاہتے تھے کہ ادب اور اساطیر عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جو اِس موضوع پر کام کرنے کے دوران میں اُن کے پیشِ نظر نہ رہا ہو۔ اِس ناچیز سے بھی اُنھوں نے اردو شاعری میں ناگ کے حوالے سے کہے جانے والے شعروں کو الگ کر دینے کی بات کی تھی تا کہ مار پرستی کے سفر کے اِس پڑاؤ کا ذکر کرنا ممکن ہو سکے مگر لاہور مراجعت کے باعث میں اُن کے لیے کچھ نہیں کر پایا۔ یوں بھی ہم کہاں کے دانا اور کس ہنر میں یکتا تھے کہ اُن کے کسی کام آ پاتے؟ اچھا ہوا! کہ اُن سے مَیں نے اس کام کو کر دکھانے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ ورنہ آج ضمیر کی خلش، سکھ کا ایک سانس بھی لینے نہ دیتی۔

مری شاعری کے علاوہ مرزا صاحب کی ایک اور پسند مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''بہاؤ'' تھی۔ اُنھوں نے اِس ناول پر مرے دو صفحوں کے مضمون کو پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس ناول کی دنیا اور اسرار کی وضاحت کے لیے ایک ہزار صفحات چاہییں ہوں گے اور وہ اس قدر طویل وضاحت کرنے کے بخوبی اہل بھی تھے کہ اِس ناول کی دنیا اُنھی کی معاونت سے وجود میں آئی تھی۔ یوں اِس ناول کی وضاحت کرنا، اُن کے لیے اپنی دنیا میں داخل ہونے کے مترادف تھا۔ جس سے باہر آنے کی اُنھیں حسرت ہوتی نہ خواہش۔

مرزا صاحب سے آخری ملاقات ۲۴/ مارچ ۲۰۰۴ء کو ہوئی مگر صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر ہاتھ ہلانے تک۔ مجھے اُن کے ہمسائے میں کچھ کام تھا اور مَیں پروفیسر مرزا حنیف بیگ سے گلی میں کھڑا کچھ بات کر رہا تھا کہ مجھے مرزا ابنِ حنیف گلی کے دوسرے کنارے پر دھیمے قدموں سے جاتے دکھائی دیئے۔ بے حد نحیف و نزار، گال پچکے ہوئے، وجود پر ایک لرزہ طاری کیے وہ مری طرف ہاتھ ہلا کر اُسی رَو میں رُکے بغیر چلتے رہے اور مَیں دُکھ، حیرت اور اضطراب کے ساتھ دُور جاتے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ میری زندگی سے باہر نکل گئے اور مجھے اِس سانحے کی خبر سید عامر سہیل کے ایس ایم ایس سے ہوئی۔

صابر ظفر کا ایک شعر ہے:

جانے والا کب رُکتا ہے پیہم دیکھتے رہنے سے ۔۔۔ آنکھیں ساتھ چلی جاتی ہیں جسم وہیں رہ جاتا ہے

صابر ظفرؔ! تم نے بالکل ٹھیک کہا مجھے اِس حقیقت کا ادراک مرزا ابنِ حنیف کو آخری بار دیکھنے پر ہوا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ حسین

جرائد میں طبع شدہ مرزا ابنِ حنیف کے منتخب مضامین

درحقیقت یہ وہ مضامین ہیں جنہیں اپنی زندگی کے آخری دنوں میں مرزا صاحب نے کتابی شکل میں چھپوانے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن مرتب انگارے اپنی بے پناہ مصروفیت میں سے وقت نہ نکال سکے اور یوں وہ پروجیکٹ جو مرزا صاحب اور مرتب انگارے کا joint venture ہوتا پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے کوشش کی ہے کہ ان مضامین کا ایک مختصر سا تعارف تحریر کر دیا جائے۔ ان پر تبصرہ کرنا یا ان کے نظریات کو زیرِ بحث لانا مجھ جیسے کم علم لوگوں کے بس کی بات نہیں، یہ تو بس یہ جانیے کہ مرزا صاحب کی خواہش کا احترام ہے کہ ان کے وہ مضامین جو جرائد میں طبع ہوئے انہیں منظرِ عام پر لایا جائے لیکن وہ لوگ جنہوں نے مرزا صاحب کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اُن کے لیے یہ مضامین یقیناً مانوس جھلک رکھتے ہوں گے۔ میں نے البتہ یہاں مرزا صاحب کے تراجم کو شامل نہیں کیا۔

مصر، مصری تہذیب اور مصر کے فرمانروا فراعنہ سے مرزا صاحب کی والہانہ شیفتگی کسی سے مخفی نہیں۔ پہلا مضمون جو ۲۳ اکتوبر ۵۵ء کو ہفت روزہ قندیل لاہور میں شائع ہوا ''ہت شی پشت'' ہے۔ یہ دنیا کی پہلی باجبروت مصری ملکہ تھی جسے مرزا صاحب نے فنِ تعمیر، مصوری اور فنکاری کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک سے تجارت کے پیشِ نظر سراہا ہے اور اس نے مصر میں جو فنِ تعمیر کے نمونے چھوڑے ان کے سبب اسے مصرِ قدیم کا ''شاہ جہاں'' قرار دیا ہے۔ اس ملکہ کی نسبت ان کا ایک اور مضمون ۱۹ جنوری ۵۸ء کے امروز میں ''حطشی۔ تاریخ کی پہلی ملکہ'' کے عنوان سے طبع ہوا ہے اور ۵۵ء کے طبع شدہ مضمون کی عبارت میں قدرے اضافہ کرتے ہوئے اس ملکہ کی انتظامی صلاحیتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ہفت روزہ قندیل لاہور ۶ نومبر ۵۵ء میں طبع ہونے والے مضمون کا عنوان ''فراعنۂ مصر کے مدفون خزانے'' ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے مصریوں کی اس خواہش کو موضوع بنایا ہے کہ وہ بعد از مرگ بھی ہنگامِ زیست کی ہاؤہُو میں مبتلا ہیں اور اسی لیے انہوں نے لاشوں کو حنوط کرنے کے مختلف طریقے ایجاد کیے۔ ان طریقوں کی وضاحت کرنے کے ساتھ اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ فرعونوں سے بھی پہلے وادیٔ نیل کے باسیوں (سات ہزار برس پہلے کے لوگ) نے بھی موت و زیست کے وسیع فلسفے کی حیثیت سے عجیب و غریب رسمیں ایجاد کی تھیں۔

مصری تاریخ کے کم سن اور حسین ترین فرعون کے بارے میں مرزا صاحب کا ایک مضمون ''حسین ترین فرعون توت آنخ آمن'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ کراچی ۴ نومبر ۵۵ء میں اور دوسرا

مضمون ''طفلِ زریں کا بے بہا خزانہ'' کے عنوان سے ۹ مارچ ۷۴ء کے امروز میں طبع ہوا ہے۔ مرزا صاحب نے اس فرعون کا ذکر محبت بھرے لفظوں میں کیا ہے لیکن اس فرعون کی اہمیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھا بلکہ یہ وہ دورِ تاریخ بھی ہے جب مصری تہذیب کے بانیوں کے اقتدار کی چادر تقریباً سمٹ چکی تھی، کریٹ کی مثالی تہذیب پہلے ہی اپنے دن پورے کر چکی تھی اور ادھر بابل بھی عروج کے آخری کونے کو چھو کر گرنے ہی والا تھا۔ اس کے علاوہ اسی دَور میں وہ واقعات بھی ظہور پذیر ہو رہے تھے یا ہونے والے تھے جن کے ذکر سے یہودی لٹریچر بھرا پڑا ہے اور یہ لٹریچر اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس نے آئندہ زمانوں میں مذہبی عقائد اور سماجی زندگی میں نمایاں اور گہرے اثرات چھوڑے۔

مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ ہم تمام فراعنۂ مصر کو ظالم، متکبر اور قابلِ نفرت سمجھتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر بہت نیک اور مثالی کردار کا نمونہ تھے اور انہی میں سے ایک اخناتون تھا جو خود پُر امن رہنا اور دنیا کو امن و سکون کا گہوارہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس فرعون کے بارے میں مرزا صاحب کا ایک مضمون ۱۱ دسمبر ۵۵ء میں ہفت روزہ قندیل لاہور میں بہ عنوان ''علم بردار توحید اخناتون'' اور دوسرا مضمون مزید تفصیلات کے اضافے کے ساتھ یکم جون ۵۸ء کے امروز میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ''اخناتون ایک موحد فرعون'' ہے۔

''مغلِ اعظم'' کے عنوان سے چنگیز خان کے بارے میں ان کا مضمون ۶ مئی ۵۶ء کو ہفت روزہ قندیل لاہور میں طبع ہوا۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر ایک اور مضمون ''چنگیز خان'' ۴ اقساط میں، ۷ مئی ۵۶ء، ۲۷ مئی ۵۶ء، ۳ جون ۵۶ء اور ۱۰ جون ۵۶ء کو روزنامہ زمیندار لاہور، راولپنڈی میں شائع ہوا ہے۔ ان کی رائے میں وہ ابتداء میں مسلمانوں سے الجھنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی کے سبب یہ تباہی ان پر نازل ہوئی۔ البتہ اس کی جنگی چالوں کی تعریف یورپی مفکرین نے بھی کی ہے۔ مرزا صاحب کو افسوس اس امر کا ہے کہ اتنے جفاکش اور پُر ہیبت منگولوں کی تاریخ ماضی کے دھندلکوں میں اس طرح سے کھو گئی ہے کہ اسے اب ڈھونڈ نکالنا آسان نہیں۔

نظامِ شمسی کے سب سے روشن ستارے کو آج ناہید، زہرہ، وینس اور سوک کے نام سے پکارا اور جانا جاتا ہے لیکن ازمنۂ قدیم میں اس کا مقبول نام عشتار تھا۔ حسن و جمال کا مرقع یہ دخترِ ماہتاب مرزا صاحب کے ہاں ''عشتار ایک قدیم دیوی'' کے عنوان سے زیرِ بحث آئی ہے۔ یہ مضمون ۱۷ جون ۵۶ء کو امروز لاہور میں طبع ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب و اخلاق، رسوم و روایات اور قدیم لٹریچر کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ عشتار سے متعلقہ عقائد اور پھر ان سے برآمد شدہ نتائج کو شاملِ تاریخ نہ کر لیا جائے۔ عشتار کا ذکر سات ہزار برس پہلے سومیریوں کے سیلابِ عظیم (طوفانِ نوحؑ) کی بابلی روایت میں بھی ملتا ہے۔ ہندوؤں کی کالی (عشتار کا تخریبی روپ) اور بنگالیوں کی دُرگا عشتار ہی کا روپ ہے۔

''توتمس تاریخ کا پہلا فاتح'' امروز لاہور میں ۵۹ء میں طبع ہوا۔ تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

دنیا کے اس اولین نامور ہیرو اور بین الاقوامی فاتح فرعون توتمس سوم نے تاریخ میں پہلی بار ایک قلمرو قائم کی۔ بقول مرزا ابنِ حنیف اس نے اپنے ملکی نظام کا ایک پہلو جن خطوط پر متشکل کیا موجودہ دَور میں مغربی سلطنتوں کی بنیادیں انہی خطوط پر استوار ہوئیں۔

امروز ۵۵ء سے ۵۸ء تک کے درمیان ''طوفانِ نوحؑ کی کہانی'' کبھی طبع ہوئی۔ تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔ انہوں نے یہ کہانی اس طوفان کے بارے میں ملنے والی روایتوں اور حکایتوں کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس اعتبار سے نہایت عمدہ تحقیقی مضمون ہے اور پھر وہ یہ اُمور بھی زیرِ بحث لائے ہیں کہ کیا واقعی ایسا طوفان آیا بھی تھا یا نہیں؟ اس کا سبب کیا تھا؟ اور طوفان کا شکار کون سی اقوام ہوئیں؟ ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ طوفان عالم گیر نہ تھا اور اس نے صرف عراق، ایران اور مصر کو غرق آب کیا۔

''زیرِ زمین'' ہفت روزہ قندیل لاہور میں ۱۷ مئی ۵۹ء کو طبع ہوا۔ اس میں فرعون خوفو کے مقبرے سے ملنے والی پانچ ہزار سالہ پرانی عظیم الجثہ کشتی کا تذکرہ ہے جو وہاں اس لیے رکھی گئی تھی کہ جب خوفو کی روح آسمانی سفر پر روانہ ہو تو وہ اس میں سوار ہو کر بآسانی جہان سے گزر سکے۔

موسیقی سے مرزا صاحب کو شغف تھا یا نہیں لیکن ان کے مصری ممدوح موسیقی کے رسیا تھے۔ انہوں نے تاریخی و تحقیقی ذرائع سے ڈائیوڈورس کے اس بیان کو غلط ثابت کیا ہے کہ مصر کے لوگ گانا سیکھنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ یہ تحقیق انہوں نے ''فراعنہ مصر، موسیقی کے رسیا تھے'' کے عنوان سے کی ہے اور یہ مضمون امروز ۷ جنوری ۶۸ء میں شائع ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موسیقی مصریوں کی عام روزمرہ زندگی کا بھی حصہ تھی اور مذہبی رسومات کا بھی اور یہ بھی کہ ان کی قدیم موسیقی کی بنیاد سات سُروں پر تھی اور ان کے ہاں الغوزہ، لُوت، بربط، بنسری، چنگ، دف، ڈھول، چھتار وغیرہ آلاتِ موسیقی تھے جن میں بربط مصریوں کا محبوب ترین ساز تھا۔

''سفینۂ نوح'' امروز ۱۰ اکتوبر ۷۱ء کا اشاعت شدہ مضمون ان تمام مہموں کی رُوداد ہے جن کا اہتمام حضرت نوحؑ کی کشتی تلاش کرنے کے لیے کیا گیا لیکن بقول مصنف اب تک ان میں سے ایک بھی مہم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکی ہے۔

ملتان کی قدامت اور اہمیت کے سبب ملتان سے مرزا ابنِ حنیف کی وارفتگی اور شیفتگی سمجھ میں آتی ہے۔ دو اقساط پر مشتمل ان کی تحریر ''ملتان میں عجائب گھر کا قیام ضروری ہے'' طباعت شدہ ۱۰ مارچ ۷۳ء اور ۱۱ مارچ ۷۳ء امروز میں انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ ملتان آج سے ہزاروں برس پیشتر بھی آباد تھا اور وسعت کے لحاظ سے ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے بھی بڑا تھا اور یہ بھی کہ پاکستان ہی نہیں ہندوستان کا بھی کوئی شہر اتنا بڑا نہیں جو کم از کم چھ ہزار برس سے برابر آباد چلا آرہا ہو۔ انہوں نے ملتان کے مَلّی یا ملائی قبائل کی اہمیت کو بھی بیان کیا ہے اور ملتان کے اس گم نام جانباز کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے جس نے سوا دو ہزار سال قبل یورپ کے فاتح سکندر مقدونی کو اپنے تیر سے زخمی کیا جو بعد میں اس کے لیے جان لیوا

ثابت ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ جب پاکستان پر آریاؤں نے حملے کیے تو تب ملی ملتان سے بھارت ہجرت کر گئے تھے۔ سکندر مقدونی کو مرزا صاحب کی دنیا میں عظیم فاتح نہیں بلکہ ایک جنونی کی حیثیت سے ناپسند کیا گیا ہے چنانچہ تقریباً گزشتہ مضمون جیسی ہی تفصیلات میں کچھ اضافے کر کے انہوں نے پانچ اقساط پر مشتمل ایک مضمون تحریر کیا ہے، عنوان ہے ''پاکستان پر سکندر کا حملہ، غارت گری اور واپسی'' یہ مضمون ۵ مارچ ۸۳ء سے لے کر ۲۱ مئی ۸۳ء تک امروز میں شائع ہوا۔

''لبنان کے فیونیقی ڈھائی ہزار سال پہلے امریکہ پہنچے تھے'' امروز میں ۱۸ اپریل ۷۳ء کو طبع ہوا۔ اس میں اس تحقیق کو پیش کیا گیا ہے کہ کولمبس سے بھی پہلے لبنان سے سامی النسل فیونیقی اپنے بحری جہازوں میں امریکہ پہنچے تھے۔ یہ سمندروں کے قدیم مسافر تھے جو انگلستان بھی جایا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے دنیا کو باقاعدہ حروفِ تہجی کا نظام دیا اور جہاں جہاں گئے وہاں اپنے تجارتی مراکز قائم کیے۔ محققین کے اس نظریے کو ایک قدیم کتبے کی نقل سے تقویت پہنچی جو اصل صورت میں دستیاب نہیں ہوسکا، البتہ نقل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فیونیقی ڈھائی ہزار سال پہلے امریکہ گئے تھے۔

''ملکۂ صحرا زبّہ'' ۱۷ جون ۷۷ء کو امروز میں شائع ہوا۔ قلوپطرہ سے زیادہ دلآویز، باوقار اور عالمہ ملکہ جو شام کے قدیم صحرائی شہر پامیرا کی ملکہ تھی، اس گلگوں ملکہ کو اہل عرب زبّہ، یونانی اور رومی زینوبیا اور اس کے اپنے شہر پامیرا والے زَبّے کے نام سے پکارتے تھے۔ انتہائی پڑھی لکھی دل نشیں اور سپاہ گری کے امور سے مکمل آگاہ یہ ملکہ اپنے شوہر کے شانہ بشانہ پامیرا کے صحرائی شہر پر حکومت کرتی تھی اور بعد میں رومیوں کے ہاتھوں زوال آشنا ہوئی۔

ملکہ زَبّہ کے علاوہ مرزا صاحب نے قلوپطرہ پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ ''افسانوں کی ملکہ قلوپطرہ'' ۱۸ مارچ ۷۳ء کو امروز میں شائع ہوا۔ جس میں مرزا صاحب نے وضاحت کی ہے کہ ملکہ قلوپطرہ کی آوارگی اور جنسی غیر شائستگی کی جو داستانیں مشہور ہیں وہ سب غلط ہیں۔ سیزر اور مارک انتونی جن سے اس نے بیاہ کیا، ان کے علاوہ اس کے کسی کے ساتھ تعلقات نہیں تھے۔ ہاں البتہ وہ بے حد حسین اور ڈرامائی انداز میں چونکانے کی خُو رکھتی تھی۔

شام متعدد اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے اور گزشتہ برسوں میں شام کے شہر حلب کے جنوب میں ایک چھوٹے سے گاؤں تل مردیخ میں کھدائی کے بعد ایک شاندار تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ سوا چار ہزار برس پہلے یہ تل مردیخ اس تہذیب کا صدر مقام تھا اور ''ابلا'' کہلاتا تھا چنانچہ اسی نسبت سے اس تہذیب کو ''ابلائی تہذیب'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں سے جو پندرہ ہزار مرقوم الواح ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلا ایک ایسی وسیع، انتہائی متمدن و مہذب اور مضبوط مملکت کا مرکزی شہر تھا جس کا دائرہ اثر مصر کی مشرقی سرحدوں سے لے کر خلیج فارس اور موجودہ ترکی کے بیشتر حصے پر تھا۔ ان تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سوا چار ہزار برس قبل بھی لغات مرتب کی جاتی تھیں۔ ان الواح پر ابراہیم، اسمٰعیل،

اسرائیل، عیسو اور ساؤل کے نام درج ہیں گویا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش سے بھی پہلے یہ نام مروّج تھے۔ یہ تمام تفصیلات مرزا صاحب کے مضمون ''شام میں گمشدہ تہذیب کی دریافت'' میں درج ہیں جو ۵ نومبر ۷۷ء کے امروز میں چھپا۔

تین اقساط پر مشتمل ایک بصیرت افروز محققانہ مضمون ''دُنیا کا قدیم ترین نظام تعلیم'' ہے۔ ۱۴ جنوری، ۲۱ جنوری اور ۲۸ جنوری ۷۷ء کے امروز میں طبع شدہ اس مضمون میں بڑی صراحت سے بتایا گیا ہے کہ ساڑھے چار ہزار برس قبل عراق میں درس گاہوں کا نظام پوری طرح فروغ پا چکا تھا اور عراقی مدرسے تخلیقی ادب کے مراکز تھے جہاں عراقی خواتین بھی علم حاصل کرتی تھیں۔ عراق کے قدیم شہر ''شروپک'' سے قدیم نصابی کتب بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ بقول محقق یہ قوم انتہائی مہذب، محنتی، موجد اور صنعت و حرفت میں طاق تھی۔ سومیری نامی اس قوم نے عراق کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا تھا۔ جیومیٹری میں فیثا غورث سے منسوب مسئلہ ہزاروں برس قبل انہی سومیریوں نے معلوم کر لیا تھا۔

۲۷ فروری ۷۶ء کے امروز میں طبع ہونے والی تحریر ''وسطی پنجاب میں پاکستان کے ماضی کی تلاش'' دراصل اس خوشگوار اور دلچسپ سفر کی مختصر سی رُوداد بھی ہے جو ڈاکٹر رفیق مغل کی سرکردگی میں مرزا صاحب اور دیگر لوگوں نے وسطی پنجاب میں واقع چھوٹی سی بستی جلیل پور (ضلع ملتان) کی کھدائی اور اس علاقے میں ہزاروں برس پرانے آثار کے سروے اور دریافت کے سلسلے میں اختیار کیا۔ یہاں تحقیق کی مدد سے واضح کیا گیا ہے کہ پاکستان میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے علاقوں پر مشتمل وادیٔ سندھ کی عروج یافتہ ہڑپائی تہذیب (۱۵۰۰ء-۲۵۰۰ء ق۔م) کہیں باہر سے نہیں آئی تھی بلکہ اس عظیم و درخشندہ تہذیب نے ہمارے ہی ملک میں آنکھ کھولی، یہیں پلی بڑھی اور پھر ہڑپہ، موہنجوداڑو اور ان کے ہم عصر اور بھی متعدد قدیم پاکستانی شہروں اور قصبوں کی صورت میں ترقی کے آسمان پر جا پہنچی۔ یوں اس تحقیق نے غیر ملکی ماہرین کی اس تحقیق اور نظریے کو غلط ثابت کیا ہے کہ ہڑپائی تہذیب باہر کے کسی خطے سے ترقی یافتہ صورت میں وادیٔ سندھ میں پہنچی تھی۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور مضمون ''جلیل پور کے لوگ ہڑپائی تہذیب کے آفرید گار تھے'' ہے۔ ۲۸ مئی ۷۶ء کے امروز میں طبع ہوا دو قسطوں پر مشتمل ہے دوسری قسط ۴ جون ۷۶ء میں شائع ہوئی۔ مرزا صاحب نے یہاں پاکستان کے قدیم تہذیبی ادوار کی تقسیم کچھ یوں کی ہے۔

۱۔ قبل از ہڑپائی دَور - ۴۰۰۰ ق۔م تا ۳۰۰۰ ق۔م

۲۔ ابتدائی ہڑپائی دَور - ۳۰۰۰ ق۔م تا ۲۵۰۰ ق۔م

۳۔ عروج یافتہ ہڑپائی دَور - ۲۵۰۰ ق۔م تا ۱۵۰۰ ق۔م

۴۔ جلیل پور - ۳۵۰۰ ق۔م تا ۲۵۰۰ ق۔م

وہ لکھتے ہیں کہ جلیل پور کے لوگ بھیڑ بکریاں اور مویشی پالتے اور کاشت کاری کرتے تھے۔

ابتداء میں بے حد سادہ تھے۔ البتہ بعد میں جلیل پور کی دوسری آبادی کے لوگ پیتل اور کانسی سے بھی اپنے آلات اوزار اور ہتھیار وغیرہ بنانے لگے تھے۔ یہاں سے ملنے والے زیورات اور بناؤ سنگھار کی چیزوں سے خواتین کی مخصوص دل چسپی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی کہ پانچ ہزار سال پہلے جلیل پور تمدن کی اس سطح پر آ چکا تھا جہاں طبقاتی فرق بھی موجود تھا۔ یہیں سے ملنے والے آثار سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ ہزاروں برس قبل پاکستان اور چین میں تمدنی روابط بھی موجود تھے۔

امروز ملتان نمبر میں ۲۸ جون ۷۸ء کو ''ملتان کے چند نادر مخطوطات'' کے عنوان سے مضمون طبع ہوا جس میں نواب زادہ احسن علی خان کے کتب خانے کی مثنوی ''نل و دمن'' خان عبدالحلیم خان ترین کے کتب خانے کی ''فیاض القوانین'' اور ''رسالہ توحید'' (مصنف دارا شکوہ) اور سید رمضان شاہ گردیزی مرحوم کے کتب خانے کی ''تزک جہانگیری'' کا تعارف، تفصیل اور تصاویر پیش کی گئی ہیں۔ یہ سب قلمی نسخے ہیں اور بقول مرزا صاحب ان کی باقاعدہ اشاعت ہونی چاہیے کیونکہ یہ ملتان کا اثاثہ ہیں۔

''ملتان اور اس کے علاقے کی ازمنۂ قدیم میں اہمیت اور تہذیبی ارتقاء'' کی پہلی قسط ۲۰ دسمبر ۷۸ء اور دوسری قسط ۲۷ دسمبر ۷۸ء کے امروز میں شائع ہوئی۔ یہ مضمون ایک اعتبار سے جلیل پور کی کھدائی والے مضامین ہی کا تسلسل ہے جس میں مرزا صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ قدیم پاکستانی تہذیبی ارتقاء میں ملتان کے علاقے نے نمایاں کردار ادا کیا۔ نیز ازمنۂ قدیم میں ملی قبائل کی نسبت یا کسی اور نامعلوم وجہ کی بناء پر وسطی اور زیریں پنجاب کا ایک بہت بڑا علاقہ ان کے خیال میں ''ملوہہ'' کہلاتا تھا اور یہ ''ملوہہ'' وہی علاقہ تھا جس کا ذکر عراق کے قدیم کتبوں میں بار بار آیا ہے۔ یہ ملوہہ درحقیقت ملتان ہی ہے جو آج سے پونے پانچ ہزار برس پیشتر اس نام سے مشہور تھا۔ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ملتان ابتداء میں اہم گاؤں، پھر سب سے اہم قصبہ اور ہڑپہ و موہنجوداڑو کے عروج کے دنوں میں سب سے اہم اور سب سے بڑا شہر تھا اس کا محل وقوع ہڑپہ اور موہن جو داڑو سے بھی زیادہ اہم تھا مذہبی اعتبار سے بھی اس کی بڑی اہمیت تھی اور یہاں سورج دیوتا میترا کی پوجا کی جاتی تھی۔

آثارِ قدیمہ سے متعلق ان منتخب تحقیقی مضامین کے علاوہ مرزا ابنِ حنیف صاحب کے کچھ ایسے مضامین بھی امروز میں شائع ہوئے جن سے ان کی ہاکی کے کھیل سے دل چسپی کی غمازی ہوتی ہے۔ وہ بڑے ہی ماہرانہ انداز میں ہاکی کے کھلاڑیوں کی کارکردگی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، بصیرت افروز ماہرانہ مشورے دیتے ہیں، انہیں سراہتے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں گویا کسی ماہر کوچ کی طرح ان کی ہاکی سے چپکی گیند کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کو مرزا صاحب کی اس دلچسپی کا علم ہو لیکن میرے لیے آثارِ قدیمہ کے ماہر دھیمے دھیمے سے مرزا صاحب کی شخصیت کا یہ روپ بڑا نیارا ہے کہ وہ ہاکی جیسے تیز رفتار کھیل سے ایسا والہانہ و ماہرانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے ان مضامین سے پاکستانی ہاکی نے کوئی فیض حاصل کیا یا نہیں یہ ایک الگ موضوع ہے۔ فی الحال تو ذیل میں ان مضامین کی

فہرست درج ہے جو مرزا صاحب کے قلم سے نکلے اور صفحۂ قرطاس کی زینت بنے:

- ''مربوط اور جارحانہ کھیل سے پاکستان بھارت کو ہرا دے گا'' امروز، ۶ دسمبر ۷۲ء
- ''کیا پاکستان ہاکی میں ایشیائی اعزاز برقرار رکھے گا'' قسط اول، امروز، ۲۲ اگست ۷۴ء، قسط دوم ۲۶ اگست ۷۴ء
- ''پاکستان نے عالمی کپ ٹورنامنٹ دوسری بار جیتا'' امروز قسط اول، ۴ اپریل ۷۸ء، قسط دوم، ۵ اپریل ۷۸ء، قسط سوم ۶ اپریل ۷۸ء، قسط چہارم ۸ اپریل ۷۸ء
- ''پاکستان ہاکی کی شاندار فتح'' امروز، ۲ دسمبر ۷۸ء
- ''ایشیائی کھلاڑی ۱۹ کھیلوں میں حصہ لیں گے'' امروز، ۹ دسمبر ۷۸ء
- ''بنکاک کے میدان میں پاکستان نے ہاکی پھر جیت لی'' امروز، ۲۳ دسمبر ۷۸ء
- ''دھیان چند۔ جادوگر دھیان چند'' امروز، ۵ دسمبر ۷۹ء

☆☆☆

ڈاکٹر نعمت الحق

عجب آزاد مرد تھا

(یہ نثر پارہ ۱۹۸۵ء میں مرزا ابن حنیف کے اعزاز میں منعقد ایک تقریب میں پڑھا گیا)

یہ ۱۹۳۱ عیسوی ہے جنوبی پنجاب کے ضلع ریاست جند کی ایک تحصیل دادری میں قریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل کلیانہ نامی ایک گاؤں آباد ہے۔ اس گاؤں کے ایک طرف دُور تک پھیلے ہوئے صحرائی ٹیلے ہیں دوسری طرف خشک اور بنجر پہاڑ ہے، تیسری طرف بائیں جانب جنگل ہے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر دائیں طرف ٹیلے پر ایک مزار ہے ساتھ ہی نیم کا درخت ہے اس کی الٹی سمت، گاؤں سے تین میل دُور بائیں جانب جنگل شروع ہونے سے پہلے ایک مزار ہے جس پر گنبد موجود ہے۔ اس مزار کے اردگرد بے شمار چھوٹی چھوٹی انسانی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں جن سے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ یہ ہڈیاں ان سپاہیوں کی ہیں جو مسلمانوں اور سکھوں کی ایک جنگ میں کام آئے تھے۔ اسی گاؤں میں ایک مسجد ایسی ہے جو مندر کو گرا کر تعمیر کی گئی ہے لیکن مسجد میں گرے ہوئے مندر کے ستون باقی ہیں جن پر ہندوؤں کے ہاتھ سے بنے ہوئے تراشیدہ مجسمے اور عجیب وغریب نقش ونگار موجود ہیں۔ گاؤں کی اصل آبادی سے ذرا پرے ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات کے پرانے کھنڈر ہیں جن میں بچے چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں گاؤں کے نزدیک صحرائی ٹیلوں میں، کھنڈرات میں اور پہاڑ کے پتھروں میں سانپ غیر معمولی تعداد میں رینگتے پھرتے ہیں۔ گاؤں کی آبادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مرزا ابن حنیف کی عمر کے ابتدائی دس سال اسی گاؤں میں گزرے۔

مرزا صاحب کی پیدائش ان کے نانا کے یہاں قصبہ دجانہ میں ہوئی، صحیح تاریخ پیدائش مرزا صاحب کو بھی معلوم نہیں اگرچہ وہ ایک عرصے تک اس کی کرید میں رہے ہیں لیکن ایک راز ہی رہا۔ مڈل کے سرٹیفیکیٹ کے مطابق تاریخ پیدائش ۶ رنومبر ۱۹۳۱ء ہے اور میٹرک کی سند کے مطابق یہ تاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء ہے جب کہ مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں۔

بچہ جاننے کے عمل کے آغاز ماں کی گود سے کرتا ہے مرزا صاحب کی والدہ انہیں ان کے دادا کے قصے سنایا کرتی تھیں جو برطانوی فوج میں ملازم تھے اور اپنی شخصی خوبیوں کی وجہ سارے گاؤں کے لیے محترم تھے ان کی سخاوت شجاعت اور ذہانت کے قصے ہر شخص سناتا تھا۔ ان کی ذہانت گاؤں میں ضرب المثل بن گئی تھی اور غالباً یہی غیر معمولی ذہنی صلاحیت ان کی موت کا سبب بنی۔ وہ جوانی ہی میں کسی پراسرار ذہنی عارضے میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے تھے اور ان کی موت ابھی تک مرزا صاحب کے لیے معمہ ہے۔

مرزا صاحب کے والد مرزا حنیف بیگ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھے والد کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی اس طرح انہوں نے ناموافق حالات میں سخت زندگی گزاری اور اپنی

زندگی آپ بنائی۔ بچے کے جاننے کے عمل کا دوسرا ابتدائی مرحلہ والد کی انگلی پکڑ کر طے ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کے والد انہیں اپنے جد امجد چنگیز خان کے واقعات سناتے کہ وہ ایک عظیم فاتح جو مشرق کے ریگزاروں سے نجانے کون سی پراسرار قوت ساتھ لے کر اُٹھا اور تمام دنیا پر چھانے کے بعد پھر اسرار کی وادیوں میں گم ہو گیا کہ اس کی موت ابھی تک ایک معمہ ہے اور ایک طویل عرصے تک اس کی قبر بھی اسرار کے پردوں میں چھپی رہی۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ سے متعلق واقعات اور قصے سنائے جاتے اور خاص طور پر حضرت عمر کی شخصیت زیر بحث رہتی۔ ان کی حکمت عملی، انصاف، شجاعت سب خوبیوں نے مل کر حضرت عمر کی شخصیت کو مرزا صاحب کا آئیڈیل بنا دیا۔

مرزا صاحب دس برس کی عمر میں چوتھی جماعت کے طالب علم تھے کہ ان کے والد انہیں اپنے ساتھ پہلی بار دہلی لے گئے اور وہاں کی تاریخی عمارات کی سیر تفصیل سے کرائی۔ وہ لال قلعے کی مختلف عمارتیں دکھاتے اور ہر اہم مقام کی پوری تفصیل بتاتے رہے، قطب مینار اور اس کے اردگرد کے کھنڈرات بھی اسی سیر کے دوران دیکھے گئے اور ان سے متعلق اہم معلومات والد صاحب کی زبانی معلوم ہوئیں۔

جب دوستوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کا زمانہ آتا ہے تو بچے میں جاننے کے عمل کے ساتھ محسوس کرنے کا عمل بھی شامل ہو جاتا ہے۔ عمر کی اس حد میں بچے کا ذہن تیزی سے اثرات قبول کر کے تشکیل پاتا جاتا ہے۔ مرزا صاحب جب تک گاؤں میں رہے اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے رہے اور یہ کھیل عموماً ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات کے پرانے کھنڈرات میں کھیلے جاتے۔ یہ پراسرار ماحول ایک بچے کے لاشعور میں محفوظ ہوتا جا رہا ہے۔

بچے کی تربیت کا چوتھا مرحلہ سکول میں طے ہوتا ہے مرزا صاحب چوتھی جماعت تک گاؤں کے سکول میں پڑھنے کے بعد پانچویں سے بورڈنگ میں آ گئے۔ پانچویں کے امتحان گورنمنٹ مڈل سکول منڈی ڈب والی سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول حصار میں چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا۔

حصار ایک تاریخی شہر ہے جس میں قدیم عمارتیں پراسرار روایتوں کے ساتھ موجود ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ان عمارتوں کا ماضی پراسرار کے پردوں میں چھپتا گیا ہے۔ حصار شہر میں ایک پرانا قلعہ ہے جس میں عمارتوں کا ایک سلسلہ موجود ہے اس قلعے سے متعلق روایت ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے بنوایا تھا۔ یہاں گجری محل بھی ہے جس میں سرنگوں کا طویل و عریض سلسلہ ہے۔ ان سے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ یہاں سے ایک سرنگ بارہ یا سولہ میل کے فاصلے پر ہانسی نامی ایک قلعے تک جاتی ہے ہانسی قلعے میں فیروز شاہ تغلق رہتا تھا۔ فیروز شاہ کا تعلق اُس گجری لڑکی سے تھا جس کے لے گجری محل بنوایا گیا۔ حصار شہر کی تاریخی عمارتوں کو ایسے ہی افسانوی قصے پراسرار بنائے دیتے ہیں۔ مرزا ابنِ حنیف نے ۱۲ سال سے ۱۵ سال تک کی عمر کا حصہ اس شہر میں گزارا۔ شہر کا قدیم قلعہ سکول سے اس قدر قریب تھا کہ مرزا صاحب چھٹی کے بعد اپنے دوستوں کے ہمراہ قلعے میں کھیل کھیلتے یہ کھیل کیا ہوتے بس یہی کہ قلعے کے کھنڈروں یا کمروں میں چھپ جانا اور ایک دوسرے کو ڈھونڈنا۔ مرزا صاحب کو جب بھی موقع ملتا وہ اکیلے ہی

قلعے میں پہنچ جاتے، قلعے کے مختلف حصوں کو اس زاویہ نگاہ سے، جس سے ان کے والد نے دہلی کا لال قلعہ دکھایا تھا، دیکھتے رہتے۔ گائیڈ سے معلومات حاصل کرتے جہاں تشفی نہ ہوتی وہاں اس سے بحث کرتے۔ سکول کی طرف سے پکنک منانے کے لیے بھی اسی قلعے کو منتخب کیا جاتا۔ حصار شہر کی یہ پراسرار عمارتیں جن سے رومان کی دلفریب داستانیں منسوب تھیں، مرزا صاحب کے دل و دماغ کے گرد اسرار کا حصار کھینچتی گئیں۔

سکول کی اسی عمر میں مرزا صاحب نے ہندو دیومالائی کہانیاں جن کی تخیلاتی فضا نے قدیم عمارتوں کی ویرانی کے خلا کو پُر کرنا شروع کیا، پڑھنا شروع کیں، شکنتلا، شرون کمار، نل اور دمینتی اور کرشن کی کہانیاں، اس کے علاوہ تاریخ، تاریخ اسلام، سفرنامے، صادق حسین سردھنوی اور نسیم حجازی کے تاریخی ناول، الف لیلیٰ طلسم ہوش ربا اور تیرتھ رام فیروز پوری کے پراسرار جاسوسی ناول جو انگریزی سے ترجمہ ہوتے تھے، پڑھے۔ ان اسباب کے علاوہ تاریخ کے استاد چوہدری بختاور سنگھ کی پُرکشش شخصیت تاریخ کے مضمون میں مرزا صاحب کی دلچسپی بڑھ جانے کا ایک محرک ہے۔

تین سال تک حصار شہر میں پڑھنے کے بعد والد صاحب کا تقرر ملازمت کے سلسلے میں کرنال شہر میں ہوا۔ مرزا صاحب نویں جماعت اسی شہر کے ایک ہائی سکول سے پاس کرنے کے بعد واپس حصار آ گئے۔ میٹرک کا امتحان ۴۷ء میں دیا لیکن تقسیم ہندوپاک کے سبب پاکستان ہجرت کرنا پڑی اس لیے میٹرک کے امتحان کا نتیجہ ضائع ہو گیا۔

اس وقت مرزا صاحب کی عمر سترہ برس تھی وہ دہلی اور حصار کی تاریخی عمارات کے علاوہ ناسک شہر کے تاریخی اہمیت کے حامل مندروں کی سیر کر چکے تھے۔ آگرہ شہر میں ان کا قیام سکول کی چھٹیوں میں اپنے ماموں لطیف صاحب کے ساتھ رہا۔ یہ قیام دو طویل وقفوں پر مشتمل تھا۔ اس قیام کے دوران انہوں نے آگرہ کی ہر تاریخی عمارت کی تفصیلی سیر کی اور اس دوران اپنے مشاہدات کی دنیا کو وسیع کیا۔ مرزا صاحب کے ماموں عبداللطیف مرزا جب دہلی میں تھے تو کچھ دنوں کے لیے مرزا صاحب کا قیام ان کے ساتھ رہا عبداللطیف مرزا کی شخصیت مرزا صاحب کے ذہن کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے لطیف مرزا تاریخ اسلام کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ ان کی قربت نے مرزا ابنِ حنیف کے شوق کو پروان چڑھا کر جوانی کی حدوں کے قریب تر کر دیا۔ مرزا صاحب اپنے مشاہدے اپنے ماموں کو سناتے وہ ان کی جزئیات کی تفصیل دریافت کرتے اور انہیں نتائج اخذ کرنے پر اُکساتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب میں تجسس کی حس تیز اور غور و فکر کی عادت پختہ ہو گئی۔

انہی دنوں مرزا ابنِ حنیف کے بہنوئی محکمہ آثار قدیمہ کے ٹرانسپورٹ کے محکمے میں ملازم تھے ان کا قیام دہلی کی اس عمارت میں ہوتا تھا جہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آثار قدیمہ کی کھدائی سے ملنے والی اشیا لائی جاتیں۔ اتفاق سے مرزا صاحب کا قیام کچھ دنوں کے لیے اسی عمارت میں اپنے بہنوئی کے ساتھ رہا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ انہی دنوں مرزا صاحب کے ماموں لطیف بھی دہلی میں قیام پذیر تھے۔

مرزا صاحب اس عمارت میں جو اشیا دیکھتے ان سے متعلق مامون لطیف مرزا سے گفتگو رہتی۔ اسی عمارت میں انہوں نے مشہور ماہر علم الآثار سر مارٹی مروہیلر کو پہلی بار دیکھا۔

تقسیم ہندو پاک کے بعد مرزا صاحب پاکستان آ گئے اور کچھ عرصہ ان کا قیام اپنے بہنوئی کے ساتھ لاہور کے قلعے میں رہا جہاں محکمہ آثار قدیمہ کا دفتر تھا۔ بعد ازاں وہ ماڈل ٹاؤن میں رہے اور پھر کچھ عرصے کے لیے ڈگری (میر پور خاص) میں قیام رہا۔ ۴۹ء میں انہوں نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور ۵۰ء میں مظفر گڑھ کے ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے افرادِ کنبہ مظفر گڑھ میں رہائش پذیر تھے۔

مظفر گڑھ میں ۱۸ سال کے طویل وقفے کے بعد مرزا صاحب کا کچھ عرصہ افرادِ کنبہ کے ساتھ گزرا۔ یہاں انہیں ذہنی آسودگی نصیب ہوئی۔ آٹھویں جماعت میں ''تمدن عرب'' جو بلگرامی نے اُردو میں ترجمہ کی تھی مرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ مظفر گڑھ قیام کے دوران تاریخ کا مطالعہ وسیع ہوا۔ مذاہب عالم کا مطالعہ بھی کیا گیا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں ذہن میں بے شمار سوالات اُبھرنے لگے۔ مذہب اور عقل میں جنگ شروع ہوئی۔ زیادہ وقت صحرائی ٹیلوں میں گزرنے لگا جہاں تنہائی میں غور و فکر ہونے لگا۔ میٹرک کے بعد ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لینے کے بعد افرادِ کنبہ سے ایک بار پھر دُور ہو گئے۔ ملتان میں حصول کتب کے ذرائع نسبتاً زیادہ تھے۔ وسعت مطالعہ نے طبیعت کو تنہائی پسند بنا دیا۔ سکول کے زمانے تک زندگی ہنگامہ خیز تھی لیکن اب یکسر ایک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ کالج میں مرزا صاحب کا نام ان کی کم گوئی کی وجہ سے ''چپ شاہ'' رکھ دیا گیا حتیٰ کہ اساتذہ بھی انہیں اسی نام سے پکارتے۔ ان دنوں دو مشاغل پسندیدہ تھے۔ علمی ادبی مذہبی اور تاریخی کتب و رسائل پڑھنا اور اس مطالعے کے نتیجے میں ذہن میں اُبھرنے والے سوالات پر غور و فکر کرنا مذہب اور عقل کے درمیان جنگ شدت اختیار کرتی گئی۔ ذہنی انتشار کے اس عالم میں موسیقی سکون حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ موسیقی سے مرزا صاحب کو ہمیشہ سے والہانہ لگاؤ رہا ہے۔

کالج کا یہ زمانہ مرزا صاحب کی عمر کا وہ حصہ ہے جس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ ہسٹری سوسائٹی کا زیر اہتمام موہنجوداڑو کے لیے سٹڈی ٹور (مطالعاتی دورے) کا پروگرام بنایا گیا۔ مرزا اجلاس ٹور کے ساتھ پہلی بار موہنجوداڑو گئے۔ ان کھنڈرات میں پہنچ کر مرزا صاحب پر ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر اپنائیت سی محسوس ہونے لگی اور انجام سی خوشی اور مسرت کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے موہنجوداڑو کی تہذیب کے باشندے تھے۔ وہ موہنجوداڑو کے انہی مکانات میں رہتے ہوں گے، ان گلیوں میں گھومتے ہوں گے، اُس کھڑکی سے کوئی جھانکتا ہوگا، اُس چمنی سے دھواں اُٹھتا ہوگا۔ مرزا صاحب نے پورا ایک دن موہنجوداڑو کے کھنڈرات میں گزارا۔ یہاں سے واپسی پر وہ واقعہ پیش آیا جس نے مرزا صاحب کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ واپسی پر ڈوکری اسٹیشن پر، جہاں سے ٹرین لینا تھی ایک رات بسر کرنا پڑی۔ رات کے درمیانی حصے میں جب سب لوگ اپنے بستروں میں سو رہے تھے ایک لڑکا

ہیجانی کیفیت میں بستر سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ صورت حال ایسی تھی کہ سب لوگ جیسے سوئے ہوئے تھے ویسے ہی ننگے پاؤں اس کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سردیوں کی گھپ اندھیری رات میں، تیز برفانی ہوا ہڈیوں پار ہوئی مل جاتی تھی۔ وہ لڑکا ریلوے لائن کے درمیان میں بھاگا جا رہا تھا۔ مرزا صاحب سمیت دوسرے سب لڑکے اُس کے پیچھے تھے اور سامنے سے ٹرین آ رہی تھی جس کے انجن کی روشنی میں وہ لڑکا نظر آ رہا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ لڑکا بروقت پکڑا نہ گیا تو ٹرین کے نیچے آ جائے گا۔ مرزا صاحب دوڑنے میں تیز تھے اس لیے سب سے آگے تھے جب ٹرین بہت قریب آ گئی تو وہ لڑکا اچانک ریلوے لائن سے اُتر کر جنگل کی طرف بھاگ گیا، ٹرین گزر گئی، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، کسی کو کسی کا کچھ پتا نہ تھا وہ لڑکا بھی نہ مل سکا لیکن مرزا صاحب کو کسی بات کا افسوس نہ تھا، وہ پراسرار ماحول کے اسیر ہو چکے تھے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا اور تیز ہوا سائیں سائیں کرتی درختوں کے درمیان سے گزرتی تو پتے سرگوشیاں کرنے لگتے۔ مرزا صاحب بھاگتے ہوئے اسٹیشن سے خاصی دُور نکل آئے تھے۔ واپسی کے خوفناک و پُر ہیبت لمحے ایسے تھے کہ جن کا حاصل مسرت اور آگہی تھی۔ اُس شب اور اگلی صبح مرزا صاحب کا تصور خیال کی قوت سے تیز ہوا کے دوش پر پرواز کرتا ہوا موہنجوداڑو کی قدیم تہذیب میں پہنچ گیا۔ قدیم تہذیب کا انسان ان موسموں کا مقابلہ کیسے کرتا ہوگا؟ ان کا طرز بود و باش کیا ہوگا؟ ان کے محسوسات کے اظہار کے ذرائع کیا ہوں گے؟ اور کیسے ہوں گے؟ یہ سوالات تب سے مرزا صاحب کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ سحر زدہ لمحوں کے اس پراسرار ماحول کا گھپ اندھیرا اور دھندلی صبح مرزا ابنِ حنیف کو ان کی منزل کا نشان دے گیا۔

۵۳-۵۴ء میں مرزا صاحب فورتھ ایئر میں تھے، ۱۹۵۳ء کے اواخر اور ۱۹۵۴ء کے آغاز میں ہسٹری سوسائٹی کے زیر اہتمام تاریخی نوادرات کی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ سوسائٹی کے صدر ہونے کے حوالے سے مرزا صاحب کو نمائش کے انتظامات کے سلسلے میں جان توڑ محنت کرنا پڑی۔ ان انتظامات میں چھ ماہ صرف ہوئے۔ مرزا صاحب تاریخ کے بہترین طالب علم تھے، اس وقت تک تاریخ ہی ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور اس موضوع کے وسیع مطالعہ ہونے کے سبب اس پر مکمل عبور بھی حاصل تھا۔ اب بھی مرزا صاحب ایک اعتبار سے موضوع کے حوالے سے قدیم تاریخ سے منسلک ہیں لیکن یہ امر چونکا دینے والا ہے کہ بی اے کے امتحان کا نتیجہ آیا تو مرزا صاحب تاریخ کے مضمون میں فیل تھے۔ اس نتیجے سے مرزا صاحب اس قدر بددل ہوئے کہ کبھی بی اے کا امتحان دوبارہ نہ دیا۔ اس واقعے کے کچھ دن بعد مرزا صاحب کوئٹہ چلے گئے وہاں ان کے قیام کا عرصہ ۱۹۵۴ء سے ۶۰ء تک ہے۔ کوئٹہ میں بھی مرزا صاحب کے مطالعہ اور غور و فکر کا وہی عالم رہا۔ اب البتہ تنہا سڑکوں اور ریگستانی ٹیلوں کی بجائے ویران کھنڈروں میں وقت گزرتا۔ کون جانے یہ کھنڈر جو ہمیں ویران نظر آتے ہیں مرزا صاحب کی نگاہ ان میں کتنی انجمنیں آباد دیکھتی ہوگی۔ کوئٹہ شہر سے چھ میل دُور کلی گل محمد نامی ایک بستی ہے وہاں سے چھ ہزار سال پرانے آثار دریافت ہوئے تھے مرزا صاحب کا بیشتر وقت کلی گل محمد اور پانچ ہزار برس پرانے مقام امب سادات میں گزرتا۔ قدیم تہذیبوں سے متعلق غور و فکر کے علاوہ بی اے میں تاریخ کے مضمون میں فیل

ہو جانے کا خیال بھی ستاتا۔ یہیں ایک ٹیلے کے قریب بیٹھ کر مرزا صاحب نے فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی نے جہاں میرے سفینے کو ڈبویا ہے میں اُسی بحرِ بیکراں کی تہہ سے گوہرِ آبدار تلاش کر کے اُبھروں گا۔ اس وقت مرزا صاحب ۲۵ برس کے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک مرزا صاحب کی ذہنی تشکیل ایک خاص ماحول میں ہوئی تھی۔ والدہ کی گود میں دادا سے متعلق پراسرار قصے سنے، والد نے انگلی پکڑ کر تاریخ اسلام کی پراسرار وادیوں میں لے گئے یا چنگیز خاں کی جادو اثر شخصیات کا تعارف کرایا۔ یہاں سے آگے بڑھے تو دہلی تاریخی عمارات کی سیر کرائی جہاں ماضی کی محفل آرائیوں اور حال کی ویرانی اور تنہائی کے درمیان اسرار کے دبیز پردے حائل ہیں۔ مرزا صاحب کا بچپن کلیانہ گاؤں میں گزرا جس کے ارض وسماء طلسم ہوش رُبا سے مماثل تھے۔ عمر کے اس حصے تک ذہن میں کچھ خاکے بنتے چلے گئے۔ بچپن سے لڑکپن تک حصار شہر میں رہے۔ جہاں کی پراسرار تاریخی عمارتوں نے مرزا صاحب کے ذہن میں تشکیل پانے والے خاکوں کی تکمیل کرنا شروع کی۔ عمر کی ان حدوں میں جہاں لڑکپن اور جوانی کی حدیں ملتی ہیں اور ذہن میں تشکیل پانے والے خاکوں میں رنگ بھرنا شروع ہوتے ہیں، مرزا صاحب نے آگرے شہر کی تاریخی عمارات کا تفصیل سے مشاہدہ کیا دہلی میں آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والی اشیا کو دیکھا اس مشاہدے کے نتیجے میں مرزا صاحب کے ذہن میں اسرار کے حلقے بنتے چلے گئے یہاں مرزا صاحب کے ماموں لطیف مرزا نے ایک اہم کردار ادا کیا اور مرزا صاحب کے ذہن میں تشکیل پانے والے خاکوں میں ''کرید اور تجسس'' کا رنگ بھر دیا۔ عمر کے اس حصے میں مرزا صاحب کا مطالعہ وسیع ہوا۔ کرید اور تجسس کی حس نے نامعلوم سے معلوم کی طرف بڑھنے کی ٹھان لی۔ مطالعہ وسیع تر ہوتا گیا غور وفکر میں گہرائی آتی گئی اور پھر زندگی میں پہلی بار موہنجوداڑو کے کھنڈرات دیکھنے کا موقع ملا اور پھر یہاں سے واپسی پر سرد اندھیری رات کے پراسرار ماحول نے ان کے ذہن میں تشکیل پانے والے خاکوں میں وہ رنگ بھر دیا جس کے سبب مرزا صاحب نے اپنے گرد و اسرار کا دائرہ کھینچ لیا لیکن دنیا کی تہذیبوں پر سے اُردو جاننے والوں کے لیے اسرار کے پردے اُٹھاتے چلے گئے۔ اب تک مرزا صاحب نے جس قدر مطالعہ کیا ہے یا جو ان کے علم میں آیا ہے اس کے نتیجے میں چار شخصیتیں ان کا آئیڈیل ہیں۔ فرعون اخناتون، چنگیز خان، حضرت عمر اور قائداعظم۔ حضرت عمر اپنی اسلامی حیثیت اور قائداعظم اپنے تاریخی کردار کی وجہ سے پسندیدہ ہوسکتے ہیں۔ فرعون اخناتون کے متعلق مرزا صاحب نے جوانی میں پڑھا۔ اس لیے مرزا صاحب کی ذہنی تشکیل میں اس کردار کا حصہ کچھ زیادہ نہیں اگرچہ اس کی پسندیدگی کی ایک وجہ اس کی پراسرار موت اور اسرار کے پردوں میں چھپی ہوئی زندگی ہے۔ ایک شخصیت چنگیز خاں کی رہ جاتی ہے جس نے مرزا صاحب کی ذہنی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ مرزا صاحب کی آئیڈیل شخصیتوں میں ایک ان کے دادا اور دوسرے سپین کی تاریخ میں موسیٰ کا کردار ہے جو اُندلس میں مسلم اقتدار کی ڈوبتی ہوئی شام میں مسلمانوں کی عظمت کا استعارہ بن گیا جس کی زندگی بپھری ہوئی موجوں کی طرح تند و تیز اور موت سمندر کی گہرائیوں کی مانند پراسرار تھی۔ یہاں ہمیں چند مزید حقائق کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ ایک طویل عرصہ گھر سے الگ رہنے اور تنہائی کے احساس نے

مرزا صاحب کو ماضی کا ہم عصر بنا دیا ہوگا۔ انہیں یہ احساس تھا کہ ان کا کوئی راز داں نہیں ہے انہوں نے قدیم تہذیب کے انسان کو اپنا companion بنالیا ہوگا۔ یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے کہ چنگیز خاں، فرعون اخناتون، مرزا صاحب کے دادا اور موسیٰ کی شخصیتوں میں ایک واقعہ مشترک ہے اور وہ ان سب کی پراسرار موت ہے اور اسرار کا ایک ماحول مرزا صاحب کے لاشعور میں موجود ہے جو انہیں ایک طرف پراسرار قدیم تہذیبوں سے پردے اُٹھانے کی طرف مائل کر رہا ہے اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے گرد اسرار کا دائرہ کھینچنے کی طرف۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ مرزا صاحب نے ۵۴ء سے پہلے جو لکھا ظریف بیگ کے نام سے لکھا اور اس کے بعد جو لکھا ابنِ حنیف کے نام سے لکھا۔ یوں انہوں نے اپنے نام پر والد صاحب کے نام کا غلاف چڑھا کر اپنی ذات کے گرد اسرار کا دائرہ کھینچ دیا۔

مرزا ابنِ حنیف کی پراسرار شخصیت کی تصویر کو دیکھتے ہوئے ہم ان کی عمر کے ترپن رنگوں میں سولہویں اور اٹھارویں رنگ کو فراموش کر دیتے ہیں شاید اس لیے کہ مرزا صاحب کی موجودہ تصویر میں یہ رنگ تحلیل ہو چکے ہیں لیکن پچھلے دنوں مجھے مرزا صاحب کی تصویر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا میری نگاہ یہ کہتی ہے کہ مرزا صاحب کی تصویر سولہویں اور اٹھارویں رنگ سے مکمل ہوتی ہے اگرچہ مرزا صاحب کی دھیمی طبیعت کی موافقت سے یہ رنگ بھی دھیمے ہیں تاہم ہیں گل رنگ اور مرزا صاحب کی شخصیت کا سائیکو انالائیس کرنے والوں کے لیے یہ رنگ، جن کی جھلک مرزا صاحب کی تصانیف میں دیکھی جاسکتی ہے، نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

۵۹ء میں مرزا صاحب کی شادی ہوتی ہے ۶۰ء میں وہ ملتان واپس آجاتے ہیں، کوئٹہ میں قیام کے دوران وہ کچھ عرصہ محکمہ ٹیلی گراف میں ملازمت کرتے ہیں اور کچھ عرصہ سکول میں بحیثیت استاد کے کام کرتے ہیں، ۶۱ء میں انہوں نے ملتان میں دانش کدہ کے نام سے کتابوں کی دکان شروع کی لیکن یہ کام ان کے مزاج کے موافق نہ تھا، ۶۷ء میں تاریخی نوادرات کی نمائش کے سلسلے میں مصروفیات اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ دکان کی طرف توجہ ختم ہو جاتی ہے اور نتیجے میں کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ ۷۰ء میں انہوں نے امروز میں ملازمت شروع کی اور اب تک اسی ادارے سے منسلک ہیں۔ اسی دوران ان کی ملاقات پاکستان اور دنیا کے مشہور ماہر علم الآثار ڈاکٹر مغل سے ہوئی اور وہ پہلی بار ان کے ساتھ علم الآثار کے فیلڈ ورک کو قریب سے دیکھتے ہیں۔

۵۱ء میں انہوں نے حضرت نوح سے لے کر رسول کریم اور پھر مسلمان فرمانرواؤں کے ساتھ چنگیز خان کے شجرے بنانے کا کام شروع کیا جو بعد ازاں تشنۂ تکمیل ہی رہا۔

۵۸ء ''مار پرستی'' کے موضوع پر کام شروع کیا جو اَب تقریباً مکمل ہونے کو ہے۔ اس دوران انہوں نے سات کتابیں تصنیف کیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ (۱) ہزاروں سال پہلے (۲) دنیا کی قدیم ترین داستان (۳) بھولی بسری کہانیاں (۴) تخلیق کائنات (۵) سات دریاؤں کی سرزمین (۶) مصر کی قدیم مصوری (۷) دنیا کا قدیم ترین ادب۔ ایک تصنیف ''کیوپڈ اور سائیکی'' کے نام سے مکمل ہو چکی ہے ''مصر کا قدیم ادب'' کتابت کے مراحل میں ہے اور ''بابلی ادب'' زیر تصنیف ہے۔

☆☆☆

سمیرا احمریں

میرے والد

مرزا ظریف بیگ المعروف مرزا ابنِ حنیف میرے محترم اور مشفق والد تھے۔ وہ نہ صرف میرے بہترین والد تھے بلکہ اُستاد اور ایک اچھے دوست بھی تھے۔ مجھے جب اس رسالے ''انگارے'' کے لیے ڈاکٹر عامر سہیل صاحب نے کچھ لکھنے کے لیے کہا تو میرے لیے یہ کافی مشکل کام تھا۔ ایک بیٹی کے لیے اپنے والد کے بارے میں کچھ کہنا اور لکھنا تکلیف دہ ہوا کرتا ہے، لیکن پھر بھی میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے ان باتوں کا آغاز اُن کے بچپن سے کرتی ہوں۔

بڑی بڑی آنکھوں والا ایک معصوم بچہ جس نے دہلی سے تقریباً ۵۰ میل مغرب کی جانب وسطی پنجاب کی ریاست جیند کی تحصیل داری میں ''کلیانہ'' نامی گاؤں میں ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اس دنیا میں آنکھ کھولی۔ اس بچے کا نام مرزا ظریف بیگ رکھا گیا۔ والد کا نام محمد حنیف بیگ تھا۔ مغل خاندان میں آنکھ کھولنے والے اس بچے کو سب نے بہت پیار دیا۔ بچے کے والد اس کا خاص طور پر خیال رکھا کرتے تھے۔ اپنے والدین کی یہ دوسری اولادِ نرینہ تھی۔ ظریف بیگ کی والدہ صوم وصلوٰۃ کی پابند مشرقی وضع کی خاتون تھیں۔ اُن کا دل چاہتا کہ دنیا کی ہر نعمت اس بچے کو نصیب ہو لیکن اس بات کے باوجود وہ اس اُصول کو ضرور نبھاتیں کہ کھلانا سونے کا لقمہ اور دیکھنا شیر کی نگاہ سے۔ وہ اپنی اولاد سے بہت پیار کرتیں لیکن بے جا لاڈ پیار کبھی نہ کیا اور اسی وجہ سے اولاد کو بگڑنے نہ دیا۔

آہستہ آہستہ یہ بچہ عمر کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے سکول جانے کے قابل ہو گیا۔ والد صاب کو اس بچے میں شروع سے ہی خاص چیز دکھائی دیتی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے مرزا ظریف بیگ کو اُس زمانے کے اچھے سے اچھے سکول میں داخل کروایا۔ سکول میں بھی اس بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آہستہ آہستہ پڑھائی کی طرف رغبت بڑھتی گئی۔ یہ بچہ گھر پر دینی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کرنے لگا۔ والدین چاہتے تھے کہ یہ خوب پڑھے اور قابل انسان بن جائے۔ اسی سوچ کو پورا کرنے کے لیے والد صاحب نے جو سرکاری ملازم تھے مرزا ظریف بیگ کو بورڈنگ بھیج دیا۔ وہاں پڑھائی کا مکمل انتظام تھا۔ والدہ کے ساتھ ساتھ والد بھی اُصول پرست انسان تھے۔ غلط بات پر نہ صرف ڈانٹتے بلکہ سزا دینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ ظریف بیگ کو اپنے والد صاحب سے زندگی میں تین دفعہ سزا ملی۔ ایک دفعہ جب انہوں نے سکول سے آ کر استاد صاحب کی شکایت کی، دوسری دفعہ جب والد صاحب نے کسی ماتحت کو بلوانے کے لیے بھیجا تو شام کے اندھیرے سے ڈر گئے۔ تیسری دفعہ جب والد صاحب نے سگریٹ پیتے دیکھ لیا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود والد صاحب بیٹے پر مہربان بھی بہت تھے اور خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ اکثر چھٹیوں میں ظریف بیگ گھر آتے تو والد صاحب سیر کے لیے کہیں نہ کہیں لے جاتے۔ دس برس کی عمر میں والد صاحب انہیں دہلی

لے گئے اور وہاں دہلی کی تاریخی عمارات دیکھیں اور لال قلعہ کی سیر بھی کی۔ ہر مقام پر تاریخی پسِ منظر کے ساتھ پوری تفصیل بھی بتاتے رہے۔ قطب مینار اور اس کے اِردگرد کے کھنڈرات بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

چھٹی جماعت سے گورنمنٹ ہائی سکول حصار (موجودہ ریاست ہریانہ) میں آ گئے۔ سکول کے پاس تاریخی عمارتیں اور مختلف طرح کی سرنگیں تھیں جب کبھی موقع ملتا سکول سے اکیلے ان جگہوں کو دیکھنے آ جاتے۔ سکول کی اس عمر سے ہی ہندو دیومالائی کہانیاں پڑھنا شروع کیں۔ ان کو پڑھنے کا یہ نتیجہ نکلتا کہ جن باتوں سے اختلاف ہوتا کھل کر اس پر بحث کرتے اور جو سبق آموز باتیں ہوتیں ان سے فائدہ اُٹھاتے۔ اُس وقت سے ہی تاریخ میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ متاثر بھی تاریخ کے اُستاد چودھری بختاور سنگھ سے تھے کیونکہ وہ ایک شفیق اور مہربان استاد تھے۔ پڑھائی کے دوران ہی آگرہ کی تاریخی عمارات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اپنے ماموں مرزا لطیف بیگ جو ٹیلی فون کے محکمے میں انجینئر تھے، آگرہ رہائش رکھتے تھے کے ساتھ اور اکیلے کئی تاریخی عمارات تاج محل، جہاں آراء کی مسجد، اکبر کے دارالحکومت فتح پور سیکری اور اس طرح کی بہت سی جگہیں دیکھیں۔

جہاں مرزا لطیف بیگ کی رہائش گاہ تھی اس سے اگلی سڑک پر ایک کوٹھی تھی جو محکمہ آثارِ قدیمہ والوں کا مرکز تھی۔ برصغیر کے مختلف مقامات سے آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے دوران برآمد ہونے والی اشیا وہاں لائی جاتی تھیں، ان چیزوں کے بارے میں ماموں نے بتایا تو ان کو چیزوں کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک دن اکیلے چلے گئے اور چیزوں کو دیکھنے لگے۔ کسی نے دیکھ لیا تو وہاں سے نکال دیئے گئے۔ اب ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جن چیزوں کو انہیں دیکھنے سے منع کیا گیا ہے وہ انہیں سمجھ کر رہیں گے اور یہ جان کر رہیں گے کہ یہ سب چیزیں کہاں سے آئی ہیں۔

۱۹۴۷ء تک ظریف بیگ (میرے ابو) نے ہنگامہ پرور زندگی گزاری۔ مختلف کھیلوں میں حصہ لیا، دوستوں کی مختلف محفلوں میں خوبصورت وقت گزارا۔ قیامِ پاکستان کے وقت میرے ابو ''کلیانہ'' میں تھے۔ قیامِ پاکستان کے اعلان کے بعد ان کا گاؤں تین ماہ تک ہندوؤں کے محاصرہ میں تھا۔ تین ماہ کے اس عرصے میں اُنہوں نے فعال کردار ادا کیا۔ گاؤں کا پہرہ دینے اور ہندوؤں کے حملے کی خبر رکھنے والے لوگوں کے سربراہ مقرر ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ کیمپ میں راشن کی تقسیم میں بھی مدد کی۔ پاکستان کے قیام کے بعد مظفرگڑھ اہلِ خانہ کے ساتھ آ گئے اور پھر تقریباً تین سال بعد دوبارہ تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۰ء میں میٹرک کیا اور ۱۹۵۱ء میں ایف۔ اے کے لیے گورنمنٹ ایمرسن کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب ان میں مختلف تبدیلیاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ پہلے انہوں نے انسانوں کے ہجوم میں رہ کر زندگی گزاری تھی، لیکن اب وہ تنہائی پسند اور کم گو ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی تمام توجہ مطالعے کی طرف مبذول کر دی۔ ملتان کے کالج میں داخلہ لینے کے بعد مطالعہ زیادہ وسیع ہو گیا۔ طبیعت زیادہ سے زیادہ تنہائی پسند ہوتی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں ایف۔ اے کرنے کے بعد اسی کالج یعنی ایمرسن کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ کالج میں داخلہ لینے کے بعد بھی مشاغل وہی تھے۔ تاریخ میں دلچسپی بدرجہ اَتم بڑھتی گئی اور تاریخ کے

اچھے شاگردوں میں شمار ہونے لگا۔ تاریخ کے اساتذہ سے بھی بحث ومباحثے ہوتے اور اپنے ہم جماعتوں سے آگے تھے۔ اساتذہ کے بھی دل پسند شاگرد بن گئے۔ کالج کا مطالعاتی دورہ موہنجوڈارو گیا تو میرے ابو کا موہنجوڈارو کے کھنڈرات دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کو دیکھ کر اُن پر عجب کیفیت طاری ہوگئی اور انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہی کھوئے ہوئے گھر میں پہنچ گئے ہوں۔

بی۔اے کے امتحانات دیئے اور جب نتیجہ آیا تو حال یہ تھا کہ تاریخ کے پرچے میں فیل ہو گئے (یہ ویسے ہی ہے جیسے منٹو میٹرک میں دو مرتبہ اردو کے مضمون میں فیل ہوئے تھے) اُن کا کہنا تھا کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ اس قدر بددل ہوگئے کہ احباب کے کہنے کے باوجود پرچہ دوبارہ نہ دیا، اب اِن میں ضِد پیدا ہوگئی اور دل میں ٹھان لی کہ تاریخ ہی میں کچھ کر دکھانا ہے۔ کچھ عرصہ کوئٹہ میں بھی رہے اور کوئٹہ کے قیام کے دوران بھی مطالعے اور غور وفکر کا وہی عالم رہا۔ کوئٹہ کے قیام کے دوران ہی مختلف موضوعات پر کام شروع ہو چکا تھا۔ یہی حالات وواقعات تھے جنہوں نے مرزا ظریف بیگ کو ”مرزا ابنِ حنیف“ کے منصب پر فائز کر دیا۔ انہوں نے اپنا قلمی نام والد کے نام پر رکھا۔ والد کے نام پر کام کا آغاز کیا اور اسی نام سے بے پایاں شہرت حاصل کی۔

اب میرے ابو کی انتھک محنت اور جستجو شروع ہو چکی تھی۔ انہوں نے کام کو اہمیت دی اور خوب دل جمعی سے کام کا آغاز کیا۔

۱۹۶۰ء میں ”ہزاروں سال پہلے“ میرے ابو نے پہلی تصنیف لکھی۔ یہ ان کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کے کل ۲۶۲ صفحات ہیں۔ اس کتاب میں کل آٹھ نیلے رنگ کی تصاویر ہیں، اس کتاب میں آٹھ باب ہیں، ہر باب کا موضوع مختلف ہے۔

میرے ابو کی دوسری تصنیف ”جلجامش کی داستان“ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے ناشر مکتبہ عین الادب لاہور تھے۔ اس کے کل صفحات ۲۵۱ تھے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن کا نام ”دنیا کی پہلی داستان“ تھا۔ نام میں یہ تبدیلی ناشر نے کی تھی، اس میں کل صفحات ۲۵۱ تھے۔

”بھولی بسری کہانیاں“ میرے ابو کی تیسری کتاب ہے۔ یہ کتاب جولائی ۱۹۶۴ء میں ادب مرکز کرشن نگر لاہور نے شائع کی تھی۔ اس کتاب کے ۳۰۷ صفحات ہیں۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں پہلے حصے میں ”فرعونوں کا دیس“ کے عنوان سے دو کہانیاں ”آئسس اور اوزیرس“ اور ”دہقان زادہ تختِ شاہی پر“ شامل ہیں۔ دوسرے حصے کا عنوان ”سندھ اور گنگا کی وادیوں میں“ ہے۔ اس حصے میں بھی دو کہانیاں ”شوپاربتی“ اور ”نل دمینتی“ شامل ہیں۔ تیسرے حصے کا عنوان ”دیوتاؤں کی سرزمین ___ یونان“ ہے۔ اس حصے میں ”پرسیفونی کا اغوا“ کے عنوان سے ایک کہانی شامل ہے۔ میرے ابو اپنے اس شوق کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ کوئٹہ میں ایک سکول میں درس وتدریس کے شعبے سے منسلک ہوئے۔ پھر کوئٹہ چھوڑ کر ملتان آ گئے اور یہاں پر ”دانش کدہ“ کے نام سے حسین آگاہی میں کتابوں کی دکان کھولی۔ اب

صورتِ حال کچھ یوں بنی کہ ایک طرف شوق اور دوسری طرف گھریلو ذمہ داریاں بھی تھیں۔ اُس دوران ان کی شادی کا فریضہ انجام پا چکا تھا، لیکن انہوں نے ان کاموں کو خوش اُسلوبی سے نبھانے کی سوچی اور جو شخص محنتی اور ذمہ دار ہو اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہوا کرتا اور انہوں نے یہ کام بہتر طور پر کیے۔ کتابوں کی دکان ”دانش کدہ“ زیادہ عرصہ نہیں چل سکی کیوں کہ کتابوں کے شوقین زیادہ وقت خود کتابوں کو پڑھتے دکھائی دیتے۔ اسی دوران لکھنے کا کام مسلسل جاری ہوا۔

”تخلیق کائنات“ میرے ابو کی چوتھی کتاب ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۶ء میں کوہِ نور پبلی کیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور نے شائع کی۔ کتاب کے کل صفحات ۱۸۸ ہیں۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان عراق ہے۔ جس کے دو ضمنی عنوانات ”سومیری دور“ اور ”بابلی دور“ ہیں۔ دوسرے حصے کا نام ”یونان“ ہے۔ اس میں ایک ضمنی عنوان ”یونانی دور“ ہے۔

”دانش کدہ“ بند ہونے کے بعد ۱۹۷۰ء میں ”امروز ملتان“ میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں بھی میرے ابو اپنے پسندیدہ تحقیقی موضوعات پر کام کرتے رہے۔ البتہ دفتری مصروفیات کے باعث انہیں اپنے تحقیقی کام کے لیے وقت بہت کم ملتا، لیکن انہوں نے محنت کو اپنا شیوہ بنائے رکھا۔

میرے ابو کی پانچویں کتاب ”سات دریاؤں کی سرزمین“ ہے، جو اکتوبر ۱۹۸۰ء میں پہلی بار کاروانِ ادب ملتان کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ کتاب کے کل صفحات ۲۶۴ ہیں۔ اس کتاب کا یہ ایڈیشن بازار میں دستیاب نہیں۔ سرورق پر ایک بیل کی تصویر اور دو سنگی بتوں کی تصویریں ہیں۔ فلیپ پر سات دریاؤں کی سرزمین کا تعارف دیتے ہوئے اس سرزمین کی قدیم تہذیب کو ”پُر اسرار“ تہذیب کا نام دیا ہے کیونکہ اس کے بہت سے اہم گوشے صیغۂ راز میں ہیں۔ ”مصر کی قدیم مصوری“ میرے ابو کی چھٹی کتاب ہے۔ جو نومبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ناشر کاروانِ ادب ملتان ہیں۔ اس کتاب کے کل صفحات ۱۸۴ ہیں۔ کتاب کے سرورق پر مشہور فرعون رامیسس دوم کی ملکہ نفرتری کی رنگین تصویر ہے۔ اس کتاب میں کل تیرہ بلیک اینڈ وائٹ تصاویر شامل ہیں۔ اس کتاب کے کل سات باب ہیں۔ میرے ابو کی ساتویں کتاب ”دنیا کا قدیم ترین ادب“ ۳۰۰۰ ق م تا ۱۷۵۰ ق م کا سنِ اشاعت ۱۹۸۲ء ہے۔ اس کے ناشر کاروانِ ادب ملتان کینٹ ہیں۔ اس کتاب کا انتساب اپنے دوست اپنے ہمدم محمد عبدالرشید کے نام ہے۔ ”دنیا کا قدیم ترین ادب“ کو اکیڈمی آف لیٹرز نے ۱۵ر مئی ۱۹۸۵ء کو ”مولوی عبدالحق ایوارڈ“ کے نام سے اوّل انعام کا حق دار قرار دیا۔ ۲۶ر جون ۱۹۸۵ء کو پانچویں اہلِ قلم کانفرنس میں میرے ابو کو چالیس ہزار روپے نقد کی صورت میں یہ انعام دیا گیا۔ اس کتاب کے کل دس ابواب ہیں اور کل صفحات ۶۸۷ ہیں۔ سرورق پر ایک قدیم عراقی خاتون کی ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر اور قدیم عراقی الواح کے دو عکس دیئے گئے ہیں۔ فلیپ پر چار ہزار سال قدیم سومیری لوری سے ایک اقتباس دیا گیا ہے۔

میرے ابو ایک مکمل شخصیت تھے۔ اپنے کام کے ساتھ ساتھ اہلِ خانہ کی ذمہ داریوں کا خیال

رکھا۔ اپنی مصروفیات میں سے ہر ممکن ہمارے لیے وقت نکالنے کی کوشش کرتے۔ ہمارے ساتھ گھلتے ملتے بیٹھ جاتے۔ وقت ملتا تو ہمارے ساتھ مختلف کھیلوں میں بھی حصہ لیتے۔ جب خاموش ہوتے تو دبدبہ ظاہر ہوتا، بات کرتے تو نزاکت و لطافت کا احساس ہوتا۔ ہماری تعلیم کا خیال رکھتے۔ پڑھائی کے بارے میں سوال کرتے اور اس سلسلے میں رہنمائی بھی کرتے۔ جب وہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ہمارے درمیان بیٹھتے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی ہم اُن کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے تھے۔ ان سب حالات کے باوجود اپنے کام پر بھی مکمل توجہ دیتے رہتے۔ وہ جس طرح کا خاموش ماحول چاہتے تھے وہ اُن کو میسر آتا۔

میرے ابو کی ایک تصنیف ''بھولی بسری کہانیاں'' ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ بھولی بسری کہانیاں (مصر) حصہ اوّل فروری ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے ناشر بیکن بکس گلگشت ملتان ہیں۔ اس کتاب کے کل صفحات ۲۷۲ ہیں۔ اس حصے میں مصر کی پانچ اساطیری اور غیر اساطیری کہانیاں شامل ہیں۔ بھولی بسری کہانیاں (بھارت) جلد دوم فروری ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے ناشر بیکن بکس گلگشت ملتان ہیں۔ اس کتاب کے کل صفحات ۶۸۸ ہیں، اس حصے میں بھارت کی پانچ اساطیری اور غیر اساطیری کہانیاں شامل ہیں۔ اس دوسری جلد میں نہ صرف شکنتلا کی کہانی کا اضافہ کیا گیا ہے، بلکہ پہلے ایڈیشن میں شامل کہانیوں ''شو پاربتی'' اور ''مل دمنیتی'' میں بہت اضافہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً ''شو پاربتی'' کہانی میں۔

''بھولی بسری کہانیاں (یونان)'' جلد سوم ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ناشر بیکن بکس گلگشت ملتان ہیں۔ اس کتاب کے ۹ ابواب ہیں۔ اس کتاب کے کل صفحات ۱۰۴۸ ہیں۔ اس میں ''پرسی خوفی کا اغوا'' دمی تر اور پرسی خوفی اور اردس سائیکی (کیوپڈ سائیکی) کی کہانی شامل ہے۔ اس تیسری جلد کے مختلف ابواب میں جا بجا بہت ساری مختصر مختصر اور قدرے طویل اساطیر بھی شامل ہیں۔

ملتان میں قلعہ کہنہ قاسم باغ میں ۱۹۸۶ء میں کھدائی کا کام عمل میں آیا تو اس کھدائی میں اپنی دلچسپی کا اظہار کھلے دل سے کیا۔ چیزوں کو حاصل کرنے کی جستجو اور شوق ان کو کئی کئی فٹ گہرائی میں لے گیا اور خود گہرائی میں نیچے اُتر کر نوادرات کو دیکھتے لوگوں کی مدد سے ان کو نکالتے اور پھر معلوم کرتے کہ یہ چیزیں کتنے فٹ کی گہرائی سے ملی ہیں۔ یہ کام خاصا محنت طلب تھا جو میرے ابو نے خوب محنت اور دل جمعی کے ساتھ کیا اور سردی، بارش اور گرمی کسی بھی قسم کے موسم کی پرواہ کیے بغیر کئی مہینوں تک مسلسل جدوجہد میں مصروف رہے۔ اسی طرح تلمبہ، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے نوادرات حاصل کرنے میں بھی ماہرین کے ساتھ مل کر محنت سے کام کیا اور ان نوادرات کو حاصل کیا۔

قلعہ کی کھدائی کے دوران کافی کام تھا۔ بعض اوقات رات کو کافی دیر سے گھر واپسی ہوتی لیکن اُس کے باوجود ہماری خیریت پوچھنا۔ دن کیسا گزرا، دن بھر کی مصروفیت کیسی رہی؟ اِسی طرح کے سوال اور مختلف باتیں کرنا ابو کے روز کے معمول میں شامل تھا۔ کیسی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو ہم سے بے نیاز کبھی نہ رہے۔

میرے ابو کی گیارہویں تصنیف ''مصر کا قدیم ادب'' ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ایک مکمل

کتاب ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد کے کل صفحات ۶۸۰ ہیں۔ اس کتاب کے پانچ ابواب ہیں۔ اس کتاب کا موضوع مصریوں کا قدیم ادب ہے۔ مصر کے ادب کی جتنی اصناف اب تک دریافت ہو چکی ہیں۔ وہ اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کے ناشر بیکن بکس گلگشت ملتان ہیں۔ اس کتاب کو بھی اکادمی ادبیاتِ پاکستان کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ ''مصر کا قدیم ادب'' کی دوسری جلد کے کل صفحات ۵۶۷ ہیں۔ اس کے ناشر بیکن بکس گلگشت ملتان ہیں۔ یہ دوسری جلد مذہبی ادب پر مبنی ہے تاہم اس میں اساطیر شامل نہیں ہیں۔ ''مصر کا قدیم ادب'' کی تیسری جلد ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی اس کے ناشر بیکن بکس گلگشت ہیں۔ اس کے کل صفحات ۶۸۸ ہیں۔ اس تیسری جلد میں حکیمانہ ادب اور مصریوں کا انتہائی اہم اور خیال آفرین قنوطی ادب شامل ہے۔

''مصر کا قدیم ادب'' کی چوتھی جلد آخری جلد ہے۔ یہ جلد بھی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے ناشر بیکن بکس گلگشت ملتان ہیں۔ کتاب کی یہ چوتھی جلد قدیم مصری شاعری کے بحیثیت مجموعی جائزے، لوک شاعری، کہانی، عشقیہ شاعری اور ڈرامے پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں جو کچھ ہے جس حد تک بھی ہے اس سے علمی ادب میں مختلف اصناف کی ارتقائی صورتِ حال پر کسی نہ کسی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کے کل صفحات ۸۰۴ ہیں۔

تصنیف و تالیف اور دفتری مصروفیات دونوں کو یکساں وقت دیا۔ اُنہوں نے ساری زندگی محنت اور جستجو میں گزاری۔ کام کرنے سے کبھی نہ گھبرائے۔ صبح امروز دفتر جایا کرتے اور رات سات، آٹھ بجے واپسی ہوتی۔ دفتر سے واپس آتے تو پوری فیملی ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھاتی۔ اس دوران مختلف موضوعات پر بات کرنے کا موقع ملتا۔ اپنے بچپن کے واقعات سناتے۔ میرے ابو شروع سے ایک سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ کسی بات پر کبھی زور سے قہقہہ نہیں لگاتے تھے بلکہ ہمیشہ دھیمے انداز میں مسکراتے۔ پھر رات دیر تک اپنے کام میں محو ہو جاتے۔ ساری زندگی محنت کی اور محنت کرنے والوں سے پیار کیا۔ وہ ایک مخلص اور خوددار انسان تھے۔ انہوں نے خودداری کے ساتھ زندگی گزاری۔

زندگی کا جیسا بھی دور آیا کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے اور نہ ہی ہمت اور حوصلہ ہارا بلکہ دوسروں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے کہ زندگی ہمیشہ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ گزارو۔ کسی تکلیف کو اپنے اوپر سوار نہ کرو۔

۱۹۹۱ء میں امروز اخبار کی بندش ہوئی تو ایک ملازمت کا دَور ختم ہو گیا۔ اب ان کی توجہ اپنے علمی کام کی طرف تھی۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۹۴ء میں انسٹیٹیوٹ آف انگلش سٹڈیز شروع ہوا تو اس کا لج سے وابستہ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کام کا سلسلہ جاری رہا اور اس جگہ اور ماحول سے اُنسیت بڑھ گئی۔ کام اس قدر لگن اور توجہ سے کیا کہ انسٹیٹیوٹ کے چلانے والوں نے ان کو سرپرستِ اعلیٰ کا درجہ دیا۔ طالب علموں کے درمیان رہ کر خوش رہتے تھے ان سے کافی پیار کرتے اور ہر بات کو تفصیل سے سمجھاتے۔ اُن کے کردار کو نکھارنے میں بھی ابو نے رہنمائی کی۔ سب کے ساتھ شفقت اور محبت کا روّیہ رہا۔ وضع دار اور خوددار انسان تھے، آن، دبدبہ بہت تھا۔

ابو نے اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کیا۔ اُنہیں بیٹیاں بہت پسند تھیں۔ کبھی بھی انہوں نے بیٹے

کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اکثر کہتے کہ مجھے بیٹے سے پیار کرنا نہیں آتا، نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ بیٹے سے کیسے پیار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، تعلیم کے اخراجات، کتابوں کی فراہمی سکول کالج اور یونیورسٹی میں داخلے کے تمام کام انہوں نے سرانجام دیئے۔ ان سب باتوں کے باوجود اُن کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ ہمیں وقت نہیں دے پاتے اور اس کا اظہار میرے سے ضرور کرتے تو میں جواب میں کہتی کہ آپ کی گھر میں موجودگی ہی ہمارے لیے اہم ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ سب کاموں کی زیادتی کی وجہ سے طبیعت اب خراب رہنے لگی اور کمزور ہوتے گئے، لیکن کام کو کام سمجھ کر کرتے رہے۔ کتابوں سے بے پناہ لگاؤ رہا۔ ابو ہمیشہ کہتے کہ یہ کتابیں بھی تمہاری طرح میری اولاد ہیں اور تمہاری طرح یہ بھی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ ابو ہمیں سکھاتے کہ کتاب کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ کتاب پھول کی طرح ہوتی ہے اس کے صفحے کو اس طرح چھوؤ جیسے پھول کی پتیوں کو چھوتے ہو۔

ابو زندگی میں نظم وضبط کے قائل تھے۔ انہوں نے زندگی قرینے اور سلیقے سے گزاری۔ ہر کام میں وقت کی پابندی کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ ہمیں بھی اُنہوں نے اِنہی اُصولوں کے ساتھ زندگی گزارنے کی تربیت دی۔ لوگوں سے تعلقات، میل جول اُٹھنا بیٹھنا، ہماری تربیت، گھر کا نظامِ گھر سے باہر کی مصروفیات، تصنیف وتالیف ہر معاملے کو ابو نے بخوبی نبھایا۔

آہستہ آہستہ صحت میں پیچیدگیاں پیدا ہونی شروع ہوگئیں اور ابو کبھی کسی بیماری کو جھیلتے تو کبھی کسی دوسری بیماری کا سامنا کرتے، لیکن ان سے جب بھی پوچھا جاتا کہ طبیعت کیسی ہے؟ تو یہی جواب ملتا اللہ کا شکر ہے اچھا ہوں اور بالکل ٹھیک ہوں۔ کبھی اپنی بیماری کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور نہ ہی بیماریوں کو اپنے اوپر طاری کیا۔ اسی تکلیف کے ساتھ کام کرتے رہے۔ میرے ابو دل کی باتیں ہمیشہ چھپانے کے عادی رہے۔ پریشانیاں، دُکھ اور حتیٰ کہ خوشیاں بھی چھپا جاتے، کبھی کوئی بات بہ تکلیف عیاں نہیں ہونے دی۔ اچھے کاموں کو ہمیشہ چھپا کر کرنے کے عادی رہے۔ کسی ضرورت مند کو کبھی نہیں ٹالا ہر ایک کی مدد کو ہمہ وقت تیار رہتے۔

ابو کا حلقۂ احباب ہمیشہ سے وسیع رہا ہے، انہوں نے سب سے محبت کی اور محبت کے اُصول پر ہی زندگی گزاری۔ اُن کے حلقۂ احباب میں ہر طبقہ کے لوگ شامل رہے۔ انہوں نے کبھی یہ دیکھ کر دوستی نہیں کہ اس شخص سے مجھے کتنا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر اُن کے دوست انہی کے ہم عمر ہیں تو کم عمر دوست بھی ہیں۔ نوجوان دوستوں کی فہرست زیادہ وسیع ہے۔ اسی طرح شاگردوں میں بھی ہر دل عزیز رہے اور شاگردوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ابو نوجوانوں سے بہت پیار کرتے اور ان کے بارے میں کہتے ان کو آگے آنا چاہیے۔ ان کے لیے کام کرنے کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔ جو کوئی اُن کی ذات کا مشاہدہ کرتا، شیرینی پاتا اُن کے لب ولہجہ میں حد درجہ مٹھاس تھی۔

۲۰۰۲ء میں بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے سرائیکی ریسرچ سنٹر سے وابستہ ہوگئے اور اسی سنٹر سے ایک کتاب ''جنوبی پنجاب کے آثارِ قدیمہ'' (پانچ قدیم ادوار) پر کام کیا۔ اس کتاب میں

مختلف پانچ ادوار بتائے گئے ہیں۔ کتاب میں ان ٹیلوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق آج سے پونے چھ ہزار یا ساڑھے پانچ ہزار برس پہلے تک کے درمیانی عرصے سے ہے۔

۲۰۰۲ء کے بعد ابو بہت بیمار رہنے لگے۔ ۲۰۰۲ء دسمبر میں السر کی تکلیف ہوگئی۔ اب یہ دور ابو کی صحت کے لحاظ سے کافی تکلیف دہ تھا۔ ایک طرف کام سے لگاؤ تو دوسری طرف بیماریاں، اس صورت میں بھی انہوں نے علمی کام کو خیر باد نہ کہا۔ ایک ساتھ کئی کام شروع تھے، جن کتابوں پر ابو زیادہ کام کررہے تھے وہ ''بابلی ادب'' اور ''مار پرستی'' ہیں۔ ''مار پرستی'' ابو کی غیر مطبوعہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کا موضوع ''مار پرستی'' ہے۔ جس میں مار پرستی کے پسِ منظر کے طور پر اس کا آغاز، اس سے متعلق مختلف قوموں میں عقائد ونظریات اور مختلف قوموں میں مار پرستی کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسری غیر مطبوعہ تصنیف ''بابلی ادب'' جو ۲۳۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م تک پھیلا ہے۔ اس عرصے میں جو اقوام اس علاقے (قدیم عراق) میں حکمران رہیں ان کا ادب اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ دونوں کتابیں طویل بیماری کے باعث منظرِ عام پر نہ آسکیں۔ ۲۰۰۴ء ابو ایک ایسی بیماری کا شکار ہوگئے جس کی اُمید بھی نہ کی جاسکتی تھی۔ جون ۲۰۰۴ء کو ٹیسٹ کروانے پر معلوم ہوا کہ وہ لیور کے کینسر میں مبتلا ہیں اور اس بیماری نے ابو کو کافی کمزور کردیا تھا۔ آہستہ آہستہ طبیعت سنبھلنے کے بجائے نڈھال ہوتی گئی لیکن اپنی عیادت کو آنے والے لوگوں سے بہت اچھی طرح ملتے۔ طبیعت پوچھنے پر یہی کہتے اللہ کا شکر ہے صحت یاب ہو رہا ہوں۔ دیکھنے والے بخوبی اندازہ لگا سکتے تھے کہ ابو کی اس بات میں کتنی سچائی ہے۔ جو بھی ابو کو دیکھتا اُس کی آنکھیں بھیگ ضرور جاتیں۔

۲۹؍جولائی ۲۰۰۴ء کی صبح ۵ کر ۴۰ منٹ پر ابو وفات پاگئے۔ یہ خبر کچھ ہی دیر میں پورے شہر میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد سوگوار اُن کے گھر پہنچ گئے۔ آج ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک ادارے کی موت ہوئی تھی۔ ابو ہم سب سے بہت دُور چلے گئے، لیکن اپنے موجود ہونے کا احساس ہمارے درمیان چھوڑ گئے اور یہ احساس ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ ابو کی لگن، شوق، محنت، لوگوں کے ساتھ اُن کے سچے خلوص، ایثار اور زندگی وقف کردینے کے جذبے اور ان کے بے مثال کارناموں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ انہوں نے جو محبت ہم سب لوگوں سے کی اور جو کام اس ملک کے لیے کیا اُس کا قرض ہمارے ان ناتواں کندھوں پر ہے اور شاید یہ ہم کبھی نہ چکا سکیں۔ اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم ان کے غیر مکمل کام مکمل کریں اور ان کے تمام ادھورے مقاصد پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ ابو کے چلے جانے سے نہ صرف میرا گھر خالی ہوگیا ہے بلکہ میری ذات بھی خالی ہوگئی ہے۔ میری ہر خوشی اور تکلیف میں وہ میرے ساتھ ہوتے تھے۔ جب کبھی بیمار ہوتی تو میرا بہت خیال رکھتے اور بار بار تاکید کرتے کہ ہر اُس چیز سے پرہیز کرنا جس سے بیماری اور تکلیف بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ میری ہر قسم کی کامیابی پر بہت خوش ہوتے۔ آج میں سوچتی ہوں کہ اب ایسے موقع پر ابو میرے ساتھ نہیں ہوں گے لیکن اُن کے ہونے کا احساس مجھے زندہ رکھے گا۔

☆☆☆

سمیرا احمریں

مرزا ابن حنیف کی تصنیف
''سات دریاؤں کی سرزمین''___ایک جائزہ

مرزا ابنِ حنیف کی کتاب ''سات دریاؤں کی سرزمین'' پہلی بار کاروانِ ادب، ملتان صدر کے زیرِ اہتمام اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے کل صفحات فہرست کتابیات سمیت 264 ہیں۔ اس کتاب کا یہ ایڈیشن بازار میں دستیاب نہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۷ء میں فکشن ہاؤس لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ اس کتاب کے آغاز میں مرزا ابنِ حنیف نے اس سرزمین (پاکستان) کو قدیم تہذیب کا نام دیا ہے۔

کتاب کا بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ قدیم تہذیب نے اس سرزمین کی کوکھ سے ہی جنم لیا تھا اور یہیں پروان چڑھی تھی اور یہ کہیں باہر سے نہیں آئی تھی اور یہ بات بھی عیاں کی گئی ہے کہ ہزاروں سال پہلے کے عراقی کتبوں میں ملوہہ، ماگان اور دلمون نامی جن خطوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ دراصل پاکستان میں واقع تھے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں قدیم زمانے میں ملتان کی پاکستان میں مرکزیت اور اہمیت اور پاکستان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کے ارتقاء میں یہاں کی حیثیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

اس کتاب ''سات دریاؤں کی سرزمین'' کے سات ابواب ہیں۔ پہلا باب ''پاکستان میں وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کا ارتقاء''۔۔۔ دوسرا باب ''ازمنۂ قدیم میں اندرون اور بیرونِ ملک دریائی اور بحری رابطے اور پاکستان اور عراق کے تعلقات''۔۔۔ تیسرا باب ''ہزاروں سال پہلے عراقی کتبوں میں پاکستانی علاقوں ملوہہ، ماگان اور دلمون کا ذکر''۔۔۔ چوتھا باب ''ملوہہ، ماگان اور دلمون پاکستانی خطوں وسطی پنجاب مکران اور سندھ کے نام تھے''۔۔۔ پانچواں باب ''جلیل پور کی اہمیت اور ملتان (ملوہہ وسطی پنجاب) کے علاقے میں پانچ ہزار سال قبل تہذیبی صورتِ حال''۔۔۔ چھٹا باب ''ملتان__ملوہہ (وسطی پنجاب) کا سب سے اہم شہر''۔۔۔ ساتواں باب ''ملتان (ملوہہ) کے ملی قبائل''

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا پہلا باب ''پاکستان میں وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کا ارتقاء'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کا آغاز اس اہم سوال سے ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کا ارتقاء اسی سرزمین پر ہوا یا یہ کہیں باہر سے آئی ہوئی کوئی صورت ہے؟

پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہرِ علم الآثار ڈاکٹر محمد رفیق مغل اپنی اہم تحقیق کے بعد باہر سے آنے کی بات سے انکار کرتے ہیں اور انھوں نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ یہ باہر سے نہیں آئی آثار کاویوں کے لیے کئی علمی اقدام کیے۔ ان میں ملتان کے علاقے میں ملتان سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر جلیل پور نامی پانچ سوا پانچ ہزار برس پرانی بستی کی دوبارہ کھدائی اور بہاول پور کے علاقے میں چولستان میں کام

بھی شامل ہے۔ یہاں پر اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ برصغیر پاکستان اور بھارت میں ''ابتدائی ہڑپائی دور'' کے جو مقامات اب تک دریافت کیے گئے ہیں، انھی میں جلیل پور کا اہم مقام بھی شامل ہے۔

مرزا ابنِ حنیف وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کا مطلب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ صرف صوبہ سندھ تک محدود نہیں بلکہ وادیٔ سندھ کی تہذیب سے مراد علمی واثری دنیا میں اس مخصوص تہذیب سے ہے جو متعدد پہلوؤں اور گوشوں کے لحاظ سے یکساں تھی۔ یہ تہذیب پاکستانی پنجاب اور سندھ کے علاوہ صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کے بھی کچھ حصوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

مرزا ابنِ حنیف ڈاکٹر رفیق مغل کے مقالے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس عروج یافتہ ہڑپائی تہذیب کا ارتقاء یہیں پاکستان ہی کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اس شاندار تہذیب نے پاکستان میں ہی آنکھ کھولی اور پروان چڑھی پھر عروج کو پہنچتے ہوئے زوال کا شکار ہوتی چلی گئی۔

''ہاکڑہ تمدن 3000 ق م ۔ 4000 ق م'' کے عنوان میں کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر مغل نے 4 قدیم چولستان [illegible] تلاش کر کے [illegible] وادیٔ سندھ کی تہذیب کے ارتقاء کے سلسلے دریافت کیے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب نے دراصل چولستان کی وادی ہاکڑہ میں جنم لیا تھا اور یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو جیسے بڑے بڑے شہروں کے آباد ہونے سے پہلے ہی تمدنی آثار پھیل چکے تھے۔ مرزا ابنِ حنیف نے اسی سیر حاصل بحث کو سامنے رکھتے ہوئے سات نتائج اخذ کیے ہیں جن کا خلاصہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ وادیٔ سندھ میں تہذیب کا ارتقاء ہوا تھا۔ یہ تہذیب باہر سے نہیں آئی تھی۔ مرزا ابنِ حنیف نے ڈاکٹر رفیق مغل کے انگریزی کے دو مضامین سے کچھ اقتباسات ترجمے کی صورت میں نقل کیے ہیں۔ ڈاکٹر مغل کے ایک مضمون کا عنوان "New Research on the Origins of the Indus Civilization" ہے۔ اس میں وہ پاکستان کے مختلف حصوں سے ملنے والے آثاری شواہد کی بنیاد پر قدیم پاکستانی تہذیب کے ارتقاء کا جائزہ، مختلف ادوار کی صورت میں لیتے ہیں۔ اس میں مرزا صاحب نے آٹھ سے زائد اقتباسات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

''ڈاکٹر مغل کی تھیوری کے بارے میں بیرونی محققین کی رائے'' کے عنوان سے مضمون میں مرزا صاحب کہتے ہیں کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے پاکستان ہی میں آنکھ کھولنے اور یہیں مکمل طور پر اٹوٹ اور مسلسل ارتقائی مراحل طے کر کے اپنے عروج کو پہنچ جانے کے بارے میں ڈاکٹر مغل کی ٹھوس تھیوری پر مشرقی اور مغربی ممالک میں خوب غور کیا گیا۔ شروع میں بعض علماء نے اختلاف کیا مگر بہت سارے محققین نے (جن میں ڈیلز، شیفر مارشیا دونوں، میڈو اور لیمبرگ کالووسکی جیسے اسکالر بھی شامل ہیں)، ڈاکٹر مغل کی بھرپور حمایت کی اور وہ ڈاکٹر صاحب کی تھیوری کو صحیح سمجھتے ہیں۔

جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے اُن کے نام اور آراء مرزا صاحب نے بیان نہیں کیں۔ اس صورت میں قاری یہ سوچتا ہے کہ مرزا صاحب کی رائے کو ہی تسلیم کر لیا جائے۔

''بہاول پور ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے ہم عصر شہر گنویری والا کی دریافت'' کے زیرِ عنوان مرزا ابنِ حنیف کہتے ہیں کہ ڈاکٹر رفیق مغل نے مسرت خیز، چونکا دینے والا اور علمی واثری لحاظ سے بے پناہ اہمیت کا حامل انکشاف کیا ہے کہ صحرائے بہاولپور میں ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے ہم عصر اتنے ہی بڑے اور وسیع وعریض قدیم شہر ''گنویری والا'' کی دریافت ہوئی ہے۔اب پاکستان میں ''وادیٔ سندھ'' کی ہڑپائی تہذیب کے آئینہ دار ہزاروں برس پرانے شہروں کی تعداد تین ہوگئی ہے یعنی ہڑپہ، گنویری والا (پنجاب) اور موہنجوڈارو (سندھ)

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا دوسرا باب ''ازمُنہ قدیم میں اندرون و بیرون ملک دریائی اور بحری رابطے اور پاکستان وعراق کے تعلقات'' پر مبنی ہے۔قدیم پاکستان اور عراق کے درمیان براہ راست تجارتی تعلقات اور رابطے کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ملتا۔اگر کوئی رابطہ یا تعلق ان دونوں ملکوں کے درمیان رہا بھی ہوگا تو بحرین کے لوگ ہی ذریعہ بنے ہوں گے۔

مرزا صاحب کا خود یہ بھی کہنا ہے کہ قدیم پاکستانی تاجر خود بھی یہ کام کرتے ہوں گے۔ازمُنہ قدیم میں پاکستان سے عراق اور عراق سے پاکستان تک جہازوں کی آمد ورفت ممکن ہونے کا ثبوت جنوری 1978ء میں سرکنڈوں کی بادبانی کشتی میں سفر کے بعد مہیا کر دیا ہے۔

''سکندرِ اعظم کو بحری معلومات پاکستانیوں نے فراہم کیں'' کے عنوان کے تحت مرزا ابنِ حنیف اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ قدیم پاکستانی تاجر دوسرے ملکوں کے ساتھ برّی، دریائی سفر، رابطوں اور راستوں سے بخوبی واقف تھے۔اس لیے سکندرِ اعظم کو بابل تک کا سمندری راستہ پاکستانیوں نے بتایا ہوگا۔

''پاکستان اور عراق کے درمیان ہزاروں سال پہلے تجارت'' کے زیرِ عنوان مرزا صاحب نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ قدیم عراقی شہر اُمہ کے شواہد سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ عراق اور پاکستان کے مابین تجارتی تعلقات موجود تھے اور یہ تعلقات بحری اور برّی دونوں وسیلوں سے استوار تھے۔ پاکستان میں قدیم شہروں کے آثار سے جہازوں اور کشتیوں کی مختلف صورتیں ملی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں بحری جہاز موجود تھے۔انھی آثارِ قدیمہ سے ایسی اشیاء بھی حاصل کی گئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عراق اور پاکستان کے درمیان تجارتی روابط تھے۔

مرزا صاحب نے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ پاکستان اور عراق کے درمیانی رابطے وقتی نہیں تھے بلکہ ہزاروں برس تک برقرار رہے تھے اور اب تک چلے آرہے ہیں۔لیکن طویل عرصے میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب دونوں ملکوں میں تجارتی رابطہ منقطع ہوگیا۔ یہ تعلق کوئی ہزار برس (609 تا 1792 ق م) تک یعنی بابل کے پہلے شاہی خاندان کے فرمانروا حمورابی کے زمانے سے لے کر عراق میں اشوری سلطنت کے زوال تک'' کے دور کے مابین معطل رہا۔ پاکستانی اور عراقی آثارِ قدیمہ سے ملنے والی مختلف اشیاء جو آپس میں، مختلف خصوصیات کی وجہ سے مشترک ہیں، اُن کا بھی تقابلی جائزہ لیا ہے۔اس کے ساتھ ہی مرزا صاحب نے دونوں علاقوں کی درآمدات اور برآمدات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چار

ہزار سال پہلے عراق میں پاکستانی تاجروں کی بستی'' کے عنوان میں مرزا صاحب کے خیال میں چونکہ پاکستانی تاجروں کا قدیم زمانے میں عراق کے ساتھ رابطہ رہتا تھا اس لیے انھوں نے یقیناً عراق میں تجارتی بستیاں بھی آباد کی ہوں گی اور اس کا نام انھوں نے اپنے اصل وطن ملوہہ (پاکستان) کے نام پر ہی رکھا تھا۔مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ ریاست 'اُر' کے تیسرے حکمران خاندان (2112 ق م تا 2004 ق م) کے نوشتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی عراق میں قدیم پاکستانیوں کی چار سوا چار ہزار سال پہلے آباد کی گئی بستی کا نام (می لوح حا) کے نام پر ''ملوہہ'' ہی رکھا گیا تھا۔

اس کتاب کا تیسرا باب ''ہزاروں سال پہلے عراقی کتبوں میں پاکستانی علاقوں ملوہہ، ماگان اور دلمون کا ذکر'' کے نام سے مرزا ابنِ حنیف کے خیال میں قدیم اہلِ عراق پاکستان یا پاکستانی علاقوں کو ملوہہ (کرملوہہ) ماگان (ماگان، مگنا، ماگانا) اور دلمون (تلمون) کے ناموں سے پکارتے ہوں گے۔لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ کن خاص علاقوں کو؟ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ یہ تینوں ناموں کا قدیم عراقی کتبوں میں ایک ساتھ ذکر ہوا ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقے ساتھ ساتھ تھے۔البتہ ان کے درمیان فرق تھا۔اس کے علاوہ مرزا ابنِ حنیف نے پاکستان عراق کے درمیان قدیم زمانے میں تجارتی روابط کے دوران درآمدات اور برآمدات کی فہرست بھی دی ہے۔ ماگان، ملوہہ اور دلمون سے تانبا اور تانبے کی مصنوعات، ڈرائیو رائٹ پتھر، یو پتھر، شومار پتھر، منکے، موتی، ہاتھی دانت، عمارتی لکڑی اور لکڑی کی مصنوعات، پھلدار درخت، سرکنڈے، کھجور، خوشبودار اشیاء وغیرہ عراق والے اپنے ہاں منگواتے تھے اور پاکستان والے عراق سے اُون اور اُون کے لباس، خوشبودار تیل اور چمڑے کی اشیاء حاصل کرتے تھے۔

''ملوہہ'' کے زیرِ عنوان ان قدیم کتبوں اور تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں ملوہہ، ماگان اور دلمون کے حوالے دیئے گئے ہیں۔مرزا ابنِ حنیف کہتے ہیں کہ سومیر اور اکاد (جنوبی اور وسطی عراق) کے بہت سارے اقتصادی رشتوں اور دوسری ادبی تحریروں اور مذہبی نظموں وغیرہ میں ملوہہ کا اور کچھ کتبوں میں اس کی کشتیوں میں اس کا ذکر ہوتا ہے اور گلگامش کی داستان میں بھی ایک جگہ ملوہہ کا ذکر آیا ہے۔

''ملوہہ (پاکستان) کے جہاز کا مالک'' کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ شروکن اوّل (2334 ق م 2279 ق م) کے عراقی اکادی خاندان کے دور کی ایک بہت اہم لوح دستیاب ہوئی ہے اس میں ایسے شخص کا ذکر ملتا ہے جو ملوہہ کے ایک جہاز کا مالک تھا۔

''ماگان'' کے عنوان میں قدیم عراقی کتبوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔جن میں ماگان شہر کا ذکر ملتا ہے۔مرزا ابنِ حنیف بتاتے ہیں کہ اکاد (وسطی عراق) کے سامی النسل لوگ اپنے لب ولہجے میں ماگان کو مکان یا ماکان کہتے تھے۔ایچ۔آر۔ہال کے خیال سے ماگان کے معنی ہیں ''وہ جگہ جہاں کوئی جہازوں میں جاتا ہے''

''جہازوں کی سرزمین'' گلگامش اور ملک بقا'' کے عنوان سے ایک نظم میں ماگان ایک

مصرعے میں یوں آیا ہے

''ماگان کشتی غرق ہونے کے بعد''

ایک اکادی شہنشاہ شروکین اوّل کا پوتا نارام سن (2254ق م۔تا2218ق م) نے ماگان پر حملہ کیا تو وہاں سے ملنے والے ایک پتھر کے مرتبان پر اُس نے یہ الفاظ کندہ کرائے:

''ماگان کے مالِ غنیمت کا ایک مرتبان''

عراق کے ایک نامور اشوری حکمران اشور بنی پال (628ق م تا633ق م) نے بھی اپنے متعدد کتبوں میں ماگان اور ملوہہ کا ذکر کیا ہے۔

''دلمون'' کے زیرِ عنوان مرزا ابنِ حنیف تذکرہ کرتے ہیں کہ دلمون، کو سامی نسل کے عراقی اکادی اور بابلی وغیرہ تلمون اور اہل سومیر دلمون کہتے تھے۔سومیری بادشاہ ارنن شی (2600ق م کے لگ بھگ) نے لکھا ہے کہ ''دلمون کے جہاز میرے لیے بیرونی ملکوں سے بطور اخراج لکڑی لائے''۔سومیری اور اکادمی دلمون (تلمون) کو ایک ملک تو سمجھتے ہی تھے۔وہ اسے جنت (فردوس) بھی خیال کرتے تھے۔یعنی نیک لوگ مرنے کے بعد دلمون میں رہتے تھے۔قدیم زمانوں میں ''عظیم طوفان'' کی کہانی میں بھی دلمون کا ذکر آیا ہے۔ان کی ''دیوتا اور ننِ ہرسگ'' دیوی اس علمی ادبی اور مذہبی لحاظ سے اہم منظوم کہانی میں بھی دلمون شہر کا نام استعمال ہوا ہے۔

''پونے چار ہزار سال پہلے پاکستان (دلمون) کے ساتھ تجارت کرنے والا عراقی تاجر'' کے نام سے اس عنوان میں بتایا گیا ہے کہ سر لیونارڈ وُلی نے ۱۹۳۰ء میں عراق کے قدیم سومیر شہر ''ار'' کی کھدائی کے دوران ایک گھر برآمد کیا۔یہ ایا نسر نامی تاجر ۱۸۱۳ق م اور ۱۷۹۰ق م کے بین بین دلمون کے ساتھ ساتھ تجارت کرتا تھا۔اس تاجر کے گھر سے ملنے والی الواح سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص دلمون تانبا ''ار'' شہر میں لایا کرتا تھا۔

اس کتاب کے ''چوتھے باب'' کا نام ''ملوہہ'' ماگان اور دلمون پاکستانی خطوں وسطی پنجاب، مکران اور سندھ کے نام تھے۔'' منتخب کیا گیا ہے۔اس باب کے آغاز میں مرزا ابنِ حنیف کہتے ہیں کہ میرے نزدیک وسطی پنجاب یعنی ملتان اور ہڑپہ کے زیرِ اثر وسیع و عریض علاقہ ملوہہ کہلاتا تھا بلکہ ملتان شہر کا نام بھی ہزاروں برس پہلے ملوہہ ہی تھا۔مکران اور اس سے ملحقہ بلوچستان ہی کچھ اور علاقہ ماگان کہلاتا تھا اور دلمون جنوبی بلوچستان اور موجودہ صوبہ سندھ پر مشتمل تھا۔'' وہ اپنے قبائل کی وجہ نہیں بتاتے بلکہ اُن اشیاء کے نام گنواتے ہیں جو ان علاقوں سے عراق برآمد کی جاتی تھیں مثلاً مور، بندر، طوطے، عقیق، لاجورد موتی، منگے، زیورات وغیرہ۔مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ چوں کہ میرے نزدیک ملوہہ، ماگان اور دلمون ایک وقت پاکستان ہی کے مختلف علاقوں کے نام تھے اس لیے یہ تینوں جغرافیائی نام نہ صرف عراق کے قدیم تاریخی نوشتوں میں ایک خاص اہمیت اختیار کر گئے ہیں بلکہ پاکستان کے نکتہ نظر سے بھی ان کی اہمیت

کے پیشِ نظر ان پر غور کرنا ضروری ہے۔مختلف محققین نے ملوہہ، ماگان اور دلمون کی جغرافیائی نشاندہی کے سلسلے میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔

دلمون کے بارے میں مرزا ابنِ حنیف لکھتے ہیں کہ دلمون ایس۔این۔کریمر کے نزدیک پاکستان تھا لیکن ہنری رانس، جارج رو، ڈاکٹر مغل، ریمنڈ الچن، مائیکل رائس، جیکسن اور ڈنمارک کے ماہرین اور بیشتر محققین کے خیال میں دلمون دراصل جزیرہ بحرین کا نام تھا۔

''ملوہہ وسطی پنجاب کا نام تھا'' کے عنوان میں مرزا ابنِ حنیف ملوہہ کو پاکستان کا حصہ قرار دیتے ہوئے تفصیل سے سمجھاتے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے تائید کی صورت میں دلائل بھی دیئے ہیں اور مختلف محققین کی آراء بھی شامل کی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ کچھ محققین کا یہ خیال ہے کہ ماگان کی طرح ملوہہ بھی حقیقتاً اصطلاحی جغرافیائی نام تھا اور اہل عراق مختلف ادوار میں مختلف ممالک کو یہ نام (ملوہہ) دیتے تھے۔اگر ان علماء کا یہ خیال درست ہے تو پھر میرے خیال میں ہوتا یوں ہوگا کہ عراق والوں کے تجارتی رابطے جب بھی پاکستان سے کمزور پڑتے ہوں گے اہل عراق پاکستان کے دونوں علاقوں کے یہ نام یعنی ملوہہ اور ماگان دوسرے ممالک مثلاً جنوبی عرب، اومان، سینا، مصر، لوبیا (کسش) اور ایتھوپیا وغیرہ کے لیے استعمال کر لیتے ہوں گے۔ویسے پاکستان کے لوگ بدستور اپنے ان علاقوں کو ملوہہ اور ماگان ہی کہتے رہے۔'' مرزا ابنِ حنیف مزید کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ملوہہ پاکستانی علاقے (وسطی پنجاب) کو بھی یقیناً کہا جاتا تھا لیکن کم از کم اس کتبے کے زمانے میں اہل عراق ملوہہ پاکستان کے لیے نہیں بولتے تھے۔

اس عنوان کے سلسلے میں جو سیر حاصل بحث مرزا ابنِ حنیف نے کی ہے اُس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ملوہہ دراصل قدیم پاکستان کی وادی سندھ کے تہذیبی علاقوں اور ان سے متصل خطوں کا نام تھا۔خود لفظ ملوہہ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ پاکستان ہی میں تھا۔

''ماگان سے مراد مکران (بلوچستان) ہے'' اس عنوان میں مرزا ابنِ حنیف بتاتے ہیں کہ محققین کی مختلف آراء کے مطابق خطۂ ماگان عراق کے مغربی میں تھا اور بعض اسے مکران (بلوچستان، پاکستان) مصر، عرب اومان، جنوب عرب کا کوئی خطہ، خلیج فارس کا عربی ساحل، مشرقی عرب یا اس کا کوئی حصہ اور یا سینا سے جسے عراقی ماگان کہتے تھے، عراق درآمد کیا جاتا تھا لیکن مرزا ابنِ حنیف کو اس بات سے اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بلوچستان کے ساحل مکران کی بندرگاہوں سے سومیر (جنوبی عراق) اور بحرین وغیرہ کے لیے تجارتی سامان برآمد کیا جاتا تھا۔چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ نارام سن اور گودہ کے زمانوں میں ڈائیورائٹ حکمران (پاکستان) سے جاتا تھا اور ماگان پاکستان کے علاقے حکمران بلوچستان کو ہی کہتے ہیں۔

''دلمون سندھ کا نام تھا'' میں مرزا ابنِ حنیف کہتے ہیں کہ پانچ ہزار برس قبل دلمون سے عراق کو ایک بہت بڑے پیمانے پر مادّی اشیاء برآمد کی جاتی تھیں۔قدیم کتبوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلمون

کے سوداگر سومیر کے شہر ''اِر'' میں رہتے تھے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ مختلف وجوہ کی بناء پر میرا خیال ہے کہ ''دلمون'' پاکستان کے ایک علاقے کا نام تھا جس میں موجودہ صوبہ سندھ، جنوبی بلوچستان اور ملحقہ علاقے شامل تھے۔ دلمون سے میرے پاکستان ہی میں ملوہہ تھا۔ جو وسطی پنجاب کے علاقوں پر مشتمل تھا اور پاکستان کا صوبہ پنجاب مکران سمیت اس قدیم زمانے میں عراقیوں کے ہاں ماگان (ماکان) کہلاتا تھا۔

بعض محققین دلمون کو بحرین قرار دیتے ہیں جب کہ بحرین کے آثار قدیمہ سے اوزان کا سیٹ ملا ہے جس کے بارے میں محققین کہتے ہیں کہ یہ قدیم زمانوں میں پاکستان میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود بھی محققین دلمون کو پاکستان کا علاقہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مرزا ابنِ حنیف کہتے ہیں کہ عراق کے کتبوں میں جس دلمون کا ذکر کیا گیا ہے وہ بحرین نہیں بلکہ پاکستان تھا یعنی پاکستان وہ حصہ جو اب صوبہ سندھ اور جنوبی بلوچستان پر مشتمل ہے۔

''سومیر'' کے عنوان سے مرزا ابنِ حنیف سومیر اور سومیری قوم پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں ''عراق کے قدیم شہر بابل اور خلیج فارس کے درمیانی علاقے یعنی زیریں عراق کو تیسری ہزاری قبل مسیح میں ''سومیر'' (شومیر) کا نام دیا گیا۔'' اسی خطے میں سومیری قوم آباد تھی۔ ان کے ادب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ انتہائی ذہین قوم تھی۔ انھوں نے مذہبی، علمی، ادبی اور فکری لحاظ سے ترقی کی۔ ۲۳۷۰ق م میں اکاد کے سامیوں نے انھیں مغلوب کر لیا لیکن کچھ عرصے میں وہ ''سومیری سے قدیم تر تہذیب'' کے عنوان میں مرزا ابنِ حنیف بتاتے ہیں کہ سومیری تہذیب سے بھی قدیم تر تہذیب موجود تھی۔ جیفرے بھی آثاریاتی کھدائیوں کے دوران خلیج فارس کے ساتھ بحرین، جنوبی عرب اور کویت میں اس تہذیب کے قدیم ہونے کے آثار دریافت کیے ہیں۔ جیفرے بھی جنوبی عرب، بحرین اور کویت کو دلمون قرار دیتے ہیں۔ مرزا ابنِ حنیف لکھتے ہیں کہ ارضیاتی سروے سے معلوم ہوا ہے ہ پانچ ہزار سال قبل جنوبی عرب آج کی طرح خشک چٹانوں، شور آلود سوکھے اور اتھلے گڑھوں اور صحرا پر مشتمل نہیں بلکہ خوب سرسبز و شاداب خطہ تھا۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا پانچواں باب ''جلیل پور کی اہمیت اور ملتان (ملوہہ وسطی پنجاب کے) علاقے میں ۵ ہزار سال قبل تہذیبی صورت حال'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کا پہلا عنوان ''تہذیب کے اوّلین سوتے'' ہے۔ اس میں مرزا ابنِ حنیف بتاتے ہیں کہ وسطی اور غالباً زیریں پنجاب کا ایک بہت بڑا علاقہ ''ملوہہ'' کہلاتا تھا اور وہ کہتے ہیں کہ میرا خیال سے ملتان شہر کا نام پہلے ملوہہ رکھا ہوگا۔ تقریباً پانچ ہزار برس پہلے ملتان، جلیل پور، ہڑپہ، وہنی والا، مغل والا اور دوسری کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں اور وہ خاص اہمیت رکھتی تھیں کیوں کہ وادیٔ سندھ کے قلب میں واقع تھیں اور پھر اسی علاقے کی بستیوں کی تہذیب نے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ہڑپائی تہذیب کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن جب دریائے بیاس خشک ہو گیا تو یہ قدیم تہذیب بھی مٹ گئی۔ مرزا ابنِ حنیف اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس علاقے میں پھیلے ہوئے جابجا ٹیلے اسی مٹی ہوئی تہذیب کے آئینہ دار

ہیں۔ ''جلیل پور کی اہمیت اور تہذیب کا ارتقاء'' کے عنوان میں کہا گیا ہے کہ ملتان اور ہڑپہ کے علاقے کے لوگ زراعت کار تھے۔ ان کی زندگی کے حال کا اندازہ ڈاکٹر مغل کی ان اثریاتی کاوشوں سے ہوجاتا ہے۔ جلیل پور ایک چھوٹا سا گاؤں ملتان کی تحصیل کبیر والہ میں عبدالحکیم سے کوئی تین میل دور کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے آباد ہے۔ قریب ہی قدیم ٹیلہ ہے جس کی کھدائی ڈاکٹر رفیق مغل نے ۱۹۷۱ء اور بعد میں ۱۹۷۶-۷۷ء میں کی۔ ان کھدائیوں کے نتیجے میں جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں دو تمدنی ادوار ''قبل از ہڑپائی دور (۴۰۰۰ق م تا ۳۰۰۰ق م) اور ابتدائی ہڑپائی دور ۳۲۰۰ق م تا ۲۵۰۰ق م) گزرے ہیں۔ انھی تہذیبی قدامت کی بناء پر ڈاکٹر رفیق مغل نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ پاکستان میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے علاقوں پر مشتمل وادیٔ سندھ کی عروج یافتہ ہڑپائی تہذیب کہیں باہر سے نہیں آئی تھی بلکہ اس عظیم تہذیب نے ہمارے ہی ملک میں جنم لیا، پلی بڑھی اور پھر ہڑپہ، موہنجوڈارو اور ان کے ہم عصر اور بھی کئی قدیم پاکستانی شہروں اور قصبوں کی صورت میں ترقی کرتے کرتے عروج حاصل کیا۔

''دھرتی پوجا اور زرعی رسوم'' کے حوالے سے مرزا ابنِ حنیف بات کرتے ہیں کہ قدیم جلیل پور کے لوگوں کا پیشہ زراعت تھا اس لیے ان کے ذہن میں معبود کا تصور دھرتی پوجا کا تھا۔ انھوں نے عورت (جو نسلِ انسانی کو پیدا کرنے والے اور پالنے والے) اور دھرتی (نباتات کو پیدا کرنے اور جانداروں کی حفاظت کرنے والی) کو ایک جیسا جانا اور یوں ان کے ذہنوں نے دیوتا کے بجائے دیوی کو اپنے معبود کے طور پر قبول کر لیا۔ مرزا ابنِ حنیف کا یہ بھی خیال ہے کہ فصل پکنے اور کٹنے کے بعد اس علاقے کے لوگ اپنا سالانہ زرعی تہوار بھی جوش و خروش سے مناتے تھے۔

بناؤ سنگھار، لاجورد اور افغان پاوندے'' کے عنوان میں اس بات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ جلیل پور کے آثار قدیمہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہاں کے لوگ بناؤ سنگھار بھی کرتے تھے۔ خواتین اپنی آنکھوں کو سنوارنے کے لیے سرمے، کاجل کا بھی استعمال کرتیں، ملتان کے علاقے (ملوہہ) کی بستی کے لوگ تقریباً سوا پانچ ہزار سال پہلے لاجورد کو بھی استعمال کر رہے تھے اور یہاں لاجورد افغانستان سے لایا جاتا تھا۔

''صنعتیں اور طبقاتی نظام'' کے زیرِ عنوان مرزا ابنِ حنیف کہتے ہیں کہ چولستان میں دریافت شدہ شواہد کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ ملتان کے علاقے میں مٹی کے برتن، اینٹیں اور دوسری چیزوں کو پکانے اور تانبے وغیرہ کو پگھلا کر صاف کرنے کی صنعتوں کو فروغ دیا گیا تھا اور قیمتی زیورات کے استعمال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سماجی طبقاتی نظام شروع ہو چکا تھا۔ ''رسم الخط کے اجزاء اور دوسری تہذیب میں تصویری رسم الخط ''عروج یافتہ'' ہڑپائی تہذیب کے ساتھ مر نہیں گیا تھا بلکہ بعد کے ادوار میں بھی برابر ارتقاء پذیر رہا اور مختلف مشکلیں اختیار کرتا گیا۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' میں ''چھٹا باب'' ملتان ___ ملوہہ وسطی پنجاب کا سب سے اہم شہر'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں بھی پچھلے ابواب کی طرح مختلف کئی موضوعات پر بحث کی گئی

ہے اور مرزا ابنِ حنیف نے سب سے پہلے ''ملتان کی قدامت'' کے عنوان پر بات کی ہے۔ مرزا ابن حنیف اس سلسلے میں کہتے ہیں ''بعض ٹھوس وجوہات، بیشتر معقول قیاسات اور منطقی نتائج کی بناء پر کم از کم مجھے تو پختہ یقین ہے کہ ملتان آج سے ہزاروں برس پیشتر بھی آباد تھا۔'' اُن کا خیال ہے کہ سارا شہر کافی اونچائی پر واقع ہے۔ گلیوں اور بازاروں میں چلیں پھریں تو بے شمار نشیب و فراز سامنے آتے ہیں۔ گلیاں کہیں تو بہت اونچی ہو جاتی ہیں اور کہیں بہت نیچی، وہ کہتے ہیں کہ جس اونچائی پر ملتان آباد ہے وہ قدرتی ہرگز نہیں ہے بلکہ ہزار ہا برس کے مسلسل تعمیری اور تخریبی عمل کے نتیجے میں صورت پذیر ہوئی ہے۔ ملتان کی قدامت اور اہمیت کے سلسلے میں مزید اُن کا خیال ہے کہ نہ صرف سکندر اعظم بلکہ ''عروج یافتہ ہڑپائی دور'' ۲۵۰۰ ق م تا ۲۰۰۰ ق م میں بھی ملتان میں قلعہ اور فصیل موجود تھی۔

اس علاقے کی تہذیبی قدامت کے بارے میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عراق میں دو دریا ہیں اور مصر میں صرف ایک دریا ہے جب کہ پاکستان کو قدرت نے سات بڑے دریاؤں سے نوازا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عراق و مصر میں کئی بڑے شہر آباد تھے تو پاکستان میں بھی موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے علاوہ تیسرا بڑا شہر یقیناً موجود ہوگا اور وہ شہر ان دونوں شہروں کے درمیان ہوگا اور اُس شہر کے ذریعے ان دونوں شہروں میں رابطہ رہتا ہوگا اور وہ شہر یقیناً ملتان ہوگا۔

اس عنوان کے آخر میں وہ کہتے ہیں کہ اب میں ان حضرات کی معصومانہ غلطی دور کرنا چاہتا ہوں جو ملتان کو لاکھوں برس پرانا شہر سمجھتے ہیں۔ یہ سب اساطیری روایتیں ہیں جن کا حقیقی علمی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ علمی اور اثریاتی حقائق کی دنیا میں اس قسم کی مضحکہ خیز اور بے سرو پا باتوں اور دعوؤں کی کوئی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔

مرزا ابنِ حنیف کی یہ بات حیرانی کا باعث ہے۔ اس لیے کہ خود مرزا ابنِ حنیف اپنے نظریات کی بنیاد اساطیری کہانیوں پر رکھی ہے۔ وہ اس کتاب کے چوتھے باب میں ہر موقع اور ہر شواہد و دلائل کا جواب اساطیری حوالوں سے دیتے نظر آتے ہیں۔ اس باب میں بھی انھوں نے ملتان کی قدامت کے حوالے سے جو دلائل درج کیے ہیں، وہ قیاسی ہیں۔

''ملتان کی جغرافیائی اہمیت'' کے عنوان کے سلسلے میں مرزا ابنِ حنیف بتاتے ہیں کہ ملتان، ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے عروج کے دنوں میں سب سے اہم اور سب سے بڑا شہر موجود تھا۔ قدیم ادوار میں ملتان کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نہ صرف ایک دریا کے کنارے ہی آباد تھا بلکہ دو عظیم دریاؤں راوی اور چناب کا سنگم بھی اس کے پاس تھا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وادیٔ گومل کے باشندوں نے ہزاروں برس قبل ہتھالہ سے ڈیرہ غازی خان اور ملتان کی طرف ہجرت کی تھی اور یہ بات ہتھالہ کی کھدائی سے معلوم ہوتی ہے۔

''ملتان کے مختلف نام اور شہر سے وابستہ قدیم روایات'' کے عنوان میں بتایا گیا ہے کہ ملتان

کا قدیم نام کیا تھا۔ مرزا ابنِ حنیف کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں اس کا نام ملوہہ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام بھی رہا ہوگا۔ وہ ''رگِ وید'' کے حوالوں سے نام تلاش کرنے کی جستجو میں ہیں اور کہتے ہیں کہ ''رگِ وید'' میں جغرافیائی مرکز کی حیثیت پنجاب کو حاصل ہے۔ ''رگِ وید'' میں جن علاقوں اور دریاؤں کے نام استعمال ہوئے ہیں، ان میں اور آج کے ناموں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ پاکستانی علاقے کو رگِ وید میں سپت سندھو یا سپت سندھاوا یعنی ''سات دریا'' یا ''سات دریاؤں کی سرزمین'' کہا گیا ہے۔ ایران کی قدیم ترین ادبی تخلیق 'اوستا' میں پاکستان کا نام ''ہندو'' لیا گیا ہے۔ یہ نام دریائے سندھ کے پرانے نام سندھو سے مشتق ہے۔

''رگِ وید میں ملتان کا ذکر'' کے عنوان میں مرزا ابن حنیف ملتان کے ناموں سے متعلق ہی بات کو آگے کی طرف لے جاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملتان کا ایک نام ''مول استھان (ملی استھان) بھی رہا ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''رگِ وید'' میں ''ویل استھان'' (ویلا استھان) یا مہا ویل استھان'' کا ذکر آیا ہے تو انھی میں سے ایک ملتان رہا ہو۔ اور مرزا ابن حنیف کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ ''ویل استھان'' کا زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ''مول استھان'' میں بدل گیا ہو اور پھر آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے مولستان ہو گیا ہوگا۔ مرزا ابن حنیف کی تحقیق یہ بھی بتاتی ہے کہ ملتان کا ایک قدیم نام ''کیسپ پورہ'' بھی تھا اور ملتان کا ایک نام ''ملی تان'' بھی ملتا ہے۔

''آریائی اور غیر آریائی آویزش'' کے عنوان کے تحت مرزا ابن حنیف بتاتے ہیں کہ ہندوؤں کی مذہبی روایتوں کی رو سے کیسپ رشی نے ملتان کو آباد کیا اور یہاں آفتاب پرستی کی بنیاد رکھی۔ مرزا ابن حنیف کا خیال ہے کہ ملتان کے آباد ہونے کے متعلق ہندوؤں نے کیسپ رشی سے روایتیں منسوب کرنے کی وجہ اس علاقے میں ملتان کی اہمیت تھی اور یہ آریاؤں کی آمد سے قبل ہوا۔ آریاؤں کی آمد سے پہلے ملتان میں آفتاب پرستی کا رواج نہ تھا۔ بلکہ وہ کسی غیر آریائی دیوتا کی پرستش کرتے ہوں گے۔ آریائی کے غلبے کے سبب آفتاب پرستی کا آغاز ہوا ہوگا اور اسی وجہ سے آریاؤں نے مقامی باشندوں کے معبودوں کو منفی قوتیں قرار دیا ہوگا۔

''ازمُنہ قدیم میں پاکستان پر بھارتی مذاہب و روایات کی یلغار'' میں بتایا گیا ہے کہ ازمنہ قدیم میں بھارت کے ہندو، بدھ اور جین مذہب والوں نے قدیم پاکستان کے مقامی لوگوں پر اپنے مذہب و عقیدے کو زبردستی ٹھونس دیا ہوگا۔ ہندو غلبے سے قبل یہاں مادرِ عظیم یعنی زمین کی دیوی ''شو'' اور چاند دیوتا کی پوجا ہوتی تھی۔ مرزا ابنِ حنیف کی نظر میں ہزاروں برس پہلے بھی پاکستان اور بھارتی ہندوؤں کے ہیرو ''پورو'' (پورس) کو غدار کہتے ہیں۔ پورو نے سکندر اعظم سے جنگ ہارنے کے بعد صلح کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اسے اس علاقے کے عسکری راز بتائے تھے۔

''قبل از اسلام ملتان کی اہمیت'' کے عنوان میں بتایا گیا ہے کہ ملتان کو قدیم زمانوں میں بھی مذہبی حوالے سے ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے مندروں میں پاکستان اور بھارت کے

مختلف علاقوں سے لوگ یا عبادت کرنے کی غرض سے آتے اور قیمتی چڑھاوے چڑھاتے۔ اس لیے ان مندروں میں بے حد دولت جمع ہوگئی تھی جسے مسلمانوں نے حاصل کرلیا اور پھر اپنے استعمال میں لائے۔ مذہبی اعتبار سے ملتان کی اہمیت کو دیکھا جائے تو یہ شہر عراق کے قدیم شہروں اروک، اُر، لاگاش اور بابل کی طرح نظر آتا ہے۔ ملتان کے مندروں اور سونے کا بنا ہوا بُت سورج دیوتا مترا'' نامی جسے سمبا نے بنوایا تھا۔ مختلف سیّاحوں نے اس کا ذکر اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔ ان سیّاحوں نے ملتان اور اس کے تہواروں کا ذکر بھی کیا ہے۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کے ساتویں باب کا عنوان ''ملتان ملوہہ کے ملی قبائل'' ہے۔ سکندر اعظم کے پاکستان پر حملے کے وقت یہاں شی بی، کشدراکا اور ملی (ملوئی، مالوا) قبائل کے علاوہ یہاں چھوٹے چھوٹے بے شمار قبیلے آباد تھے۔ مرزا ابن حنیف کے خیال میں ملی قبائل دراوڑ تھے۔ یہ قوم ہزاروں سال سے یہاں آباد تھی۔ ملی کا مطلب ''پہاڑ کے لوگ'' ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی پہاڑی علاقے سے ہجرت کرکے یہاں آباد ہوئے تھے، ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ بلوچستان سے آئے ہوں کیوں کہ بلوچستان کا ایک علاقہ ''ملان'' کہلاتا ہے اور بلوچستان میں ایک درّے کا نام ''مولا یا ملا'' ہے۔

''ملی قبائل کی بھارت میں حکومتیں'' کے عنوان میں مرزا ابن حنیف کہتے ہیں کہ آریاؤں کے پاکستان پر حملے کے نتیجے میں ملی قبائل نے دوسرے قبیلوں کے ساتھ بھارت کا رُخ کیا اور دکن، بہار اور بنگال تک چلے گئے۔ زیادہ تر ملی مہاراشٹر میں آباد ہوگئے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے بھارت کے دوسرے علاقوں میں بھی بسیرا کرلیا اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں۔ بھارت کے مشرقی علاقے میں ملی، لچھاوی کے ساتھ مل کر رہنے لگے اور انھوں نے مل کر ریاستیں بھی قائم کیں۔ آج بھی بھارت میں راج محل کی پہاڑیوں میں آباد ہیں۔ البتہ یہ لوگ غیر مہذب ہیں۔

اس کتاب ''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب طبع زاد ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب کو لکھنے کی بنیاد مرزا ابنِ حنیف کے قیاس نظریات بن گئے۔ جن کا ذکر انھوں نے پیش لفظ میں کردیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب انھوں نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تو اس کا محرک قدیم عراقی تہذیب سے متعلق ان کا مطالعہ تھا۔ جس سے انھیں علم ہوا کہ سومیری کتبوں میں ایسے علاقوں کا ذکر ہے جو عراق کے مشرق میں واقع ہیں۔ ان علاقوں (ملوہہ، ماگان، دلمون) کے متعلق مختلف مغربی ماہرین اور محققین کے نظریات بھی ان کی نظر سے گزرے تو انھیں خیال آیا کہ یہ تینوں علاقے پاکستانی سرزمین سے متعلق ہوسکتے ہیں۔

مرزا ابن حنیف نے اس کتاب میں اپنے نظریات کو کسی حد تک درست ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر محمد رفیق مغل اور مغربی محققین کے نظریات سے مدد حاصل کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے قیاسی (فرضی) نظریات کے لیے مناسب جواز بھی پیش کیے ہیں۔ اس لحاظ سے مرزا ابنِ حنیف کی یہ

کتاب طبع زاد تصنیف میں شمار کی جاسکتی ہے۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کے پیش لفظ میں مرزا ابنِ حنیف نے علم الآثار سے اپنی لگن کی وجہ دو شخصیتوں عبداللطیف مرزا اور پروفیسر منور علی خاں کی راہ نمائی اور تربیت بتائی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ''سات دریاؤں کی سرزمین'' لکھنے کے لیے تحقیقی کام کے لیے اور اپنے نظریات کی جانچ پڑتال کے لیے پاکستان کے مختلف علاقوں میں جاکر مشاہدات کو جمع کیا اور پھر ڈاکٹر محمد رفیق مغل کی تھیوری بھی اس کتاب کو لکھنے میں معاون ثابت ہوئی۔

مرزا ابنِ حنیف کے کام پر نظر ڈالی جائے تو بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں اور اُن کا ذکر کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ مرزا صاحب ایک کتاب کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد اُس (کتاب) پر کام جاری رکھتے ہیں۔ غور طلب باتوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ''سات دریاؤں کی سرزمین'' کے ۱۹۹۷ء کے ایڈیشن کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد بھی مرزا ابنِ حنیف اُس کام سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ اسی لیے اُس میں جگہ جگہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہ تبدیلیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کی نشان دہی کرنا ضروری ہے جو کچھ اضافی صورت میں تبدیلیاں ہیں اور کچھ باتوں کو بالکل ہی ختم کردیا گیا ہے۔

مرزا ابن حنیف ''پیش لفظ'' میں ''صفحہ ۱۴'' پر اس طرح کرتے ہیں۔ پاکستان کی قدیم تاریخ اور تہذیبی ارتقاء میں ملتان و ہڑپہ کے علاقے یعنی وسطی پنجاب کو بہت نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ لیکن نظرِ ثانی کرنے کے بعد وہ وسطی پنجاب کی بجائے ''جنوبی پنجاب'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

''ان میں ملتان ضلع میں ہڑپہ سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر عبدالحکیم کے قریب وہ بستی بھی تھی جس کا نام آج ''جلیل پور'' ہے۔ اس میں ملتان ضلع میں تبدیلی کرکے ''خانیوال ضلع'' کردیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۵ پر ہی وسطی پنجاب کی جگہ جنوبی پنجاب کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۶ پر بھی یہی تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے۔ وسطی پنجاب کی جگہ 'جنوبی پنجاب' کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۷ پر ''وسطی پنجاب اور اس میں ہزاروں سال سے منفرد طور پر آباد ملتان شہر کی تہذیبی اہمیت اور مرکزیت پر نہ صرف ہزار ہا برس قبل کے بلکہ مسلم دور کے حوالے سے بھی جذباتی اور سطحی انداز سے ممکنہ حد تک گریز کرکے روشنی ڈالیں۔

مندرجہ بالا سطور کی بھی مرزا صاحب نشاندہی کرتے ہیں اور اس بارے میں کچھ اس طرح اظہار کرتے ہیں ''یہاں مجھ سے سخت بے احتیاطی اور سنگین غلطی ہوئی ہے شاید جذباتیت کا بھی شکار ہوا۔۔۔ نہ آج کوئی ۳۰ برس قبل اس بات کا کوئی آثاریاتی ثبوت تھا جب یہ کتاب لکھی گئی تھی اور نہ آج ہے۔ مجھے سخت شرمندگی اور غصہ ہے خود پر۔۔۔ مجھے یہاں صرف اپنے قیاس کا اظہار کرنا چاہیے۔ اس قدر قطعیت سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' صفحہ ۱۸ پر بھی مرزا ابن حنیف تبدیلیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پہلے لکھتے ہیں ''اس زمانے میں یہاں بھی عراق اور مصر کی طرح مدرسے یقیناً قائم تھے اور میں سمجھتا

ہوں کہ عراق کے ''سومیری دور'' کی طرح پاکستان میں اس وقت درس گاہوں کا باقاعدہ نظام قائم تھا۔ اس دور میں یہاں معبد بھی تھے۔''

تبدیل شدہ صورت کچھ یوں ہے۔۔''اس زمانے میں پاکستان میں بھی عراق اور مصر کی طرح مدرسے قائم رہے ہوں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ عراق کے سومیری دور کی طرح پاکستان اس وقت درس گاہوں کا باقاعدہ نظام قائم تھا۔اس دور میں یہاں مصر اور عراق کی طرح معبد رہے ہوں گے۔''

صفحہ ۱۸ پر ہی دوسرے پیراگراف کی پہلی سطر کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔۔قدامت کے لحاظ سے پاکستان کے ہم عمر ممالک عراق اور مصر میں ہزار ہا سال پہلے علم وفنون نے آنکھ کھولی اور خوب ترقی کی۔

اس جملے کو مرزا ابنِ حنیف نے تبدیل کرکے کچھ اس طرح لکھا ہے۔۔۔''قدامت کے لحاظ سے ایک وقت پاکستان کے ہم عصر ممالک عراق اور مصر میں ہزار ہا سال پہلے علم وفنون نے آنکھ کھولی اور خوب ترقی کی۔اس میں انھوں نے ''ایک وقت'' کا اضافہ کیا ہے۔

صفحہ ۱۹ پر ''بعد کی ہندو فلاسفی اور دوسرے علوم کے سوتے پاکستانیوں کے افکار وعلوم سے ہی پھوٹے تھے''

مرزا ابن حنیف نے اس جملے میں ''پاکستانیوں'' سے پہلے ''قدیم'' کا لفظ مناسب سمجھتے ہوئے شامل کر دیا ہے۔

مرزا ابن حنیف کی اس کتاب ''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا پہلا باب ''پاکستان میں وادی سندھ کی قدیم تہذیب'' کے عنوان سے ہے۔

اس باب کا میں تفصیل سے جائزہ پہلے لے چکی ہوں۔اس بات کی نشاندہی کر دوں کہ اس میں جدید ترین اثری انکشافات وشواہد کی روشنی میں پاکستان میں ''وادی سندھ کی عروج یافتہ تہذیب'' کے آغاز اور ارتقاء کا تفصیل سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں پاکستان کے مایہ ناز ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر محمد رفیق مغل کے خیال انگیز اور علمی واثری دنیا میں انقلابی نظریے کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔مرزا ابنِ حنیف نے کتاب کی نظر ثانی کی تو اس کو بھی زیرِ غور رکھا اور اس باب کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا ابن حنیف نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور انھوں نے اس کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔اس سلسلے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس باب کے حوالے سے اپنے کام سے کسی حد تک مطمئن ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اس سلسلے میں جو نظریات اپنے اور ڈاکٹر محمد رفیق مغل کے یا دوسرے محققین کے پیش کیے ہیں وہ درست ہیں۔

اس کتاب ''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا دوسرا باب ''ازمنہ قدیم میں اندرون وبیرون ملک دریائی اور بحری رابطے اور پاکستان وعراق کے تعلقات'' پر مبنی ہے۔اس میں ازمنہ قدیم میں اندرونِ پاکستان تجارتی دریائی رابطوں ہزاروں برس پہلے پاکستان اور عراق کے مابین تعلقات رہے اور ساڑھے چار ہزار برس پیشتر عراق میں پاکستانی تاجروں کی بسائی ہوئی ملوہہ نامی ایک بستی کے بارے میں نظریات

کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس حوالے سے چھوٹے چھوٹے عنوانات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے۔

اس میں مرزا ابن حنیف نے نہ تو کسی بات کا اضافہ کیا ہے اور نہ ہی کسی بات کو کتابت سے خارج کیا ہے اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ اس عنوان کے تحت کہا ہے وہ اس کو درست خیال کرتے ہیں اور اپنی بات پر ثابت قدم نظر آتے ہیں۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا تیسرا باب ''ہزاروں سال پہلے عراق کتبوں میں پاکستانی علاقوں ملوہہ، ماگان اور دلمون کا ذکر'' کے عنوان سے منسوب ہے۔مرزا ابنِ حنیف نے اس باب میں تمام پرانی تحریروں اور حوالوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو اُن کو ممکنہ حد تک مل سکے ہیں اور جن میں ملوہہ، ماگان اور دلمون کا ذکر آیا ہے۔اس باب کا تفصیلی جائزہ میں پہلے دے چکی ہوں۔اگر اس باب کو بھی دیکھیں تو مرزا ابن حنیف نے نظر ثانی کے دوران اس باب کو اُسی صورت میں رہنے دیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کام اس باب میں کیا گیا ہے جو باتیں اور دلائل پیش کیے گئے ہیں مرزا ابن حنیف انہیں درست خیال کرتے ہیں۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا چوتھا باب ملوہہ، ماگان اور دلمون پاکستانی خطوں وسطی پنجاب، مکران اور سندھ کے نام تھے۔'' کے عنوان سے سامنے آتا ہے۔ اس باب میں مرزا صاحب نے یہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ عراقی تحریروں کے یہ تینوں پراسرار خطے کون سے ہوسکتے ہیں۔

مرزا ابن حنیف نے نظر ثانی کے دوران اس کے عنوان میں ہی تبدیلی کر دی ہے اور ''وسطی پنجاب'' کی جگہ ''جنوبی پنجاب'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔جہاں بھی وسطی پنجاب کا ذکر آتا ہے مرزا ابن حنیف وہاں ''جنوبی پنجاب'' استعمال کرتے ہیں۔

اس باب کے صفحہ 136 پر مندرجہ ذیل سطریں غور طلب ہیں:

''ملوہہ کو اب عام طور پر ماہرین پاکستان ہی کا علاقہ بتاتے ہیں۔اس میں مرزا ابن حنیف ''عام طور پر'' کو جملے سے خارج کر دیتے ہیں۔''ویسے بعض محققین اسے بھارت کا سوراشٹر بھی سمجھتے ہیں۔''

اس جملے کی تصحیح مرزا ابنِ حنیف اس طرح فرماتے ہیں:

''ویسے بعض محققین اس میں بھارت کا علاقہ سوراشٹر بھی شامل کر دیتے ہیں۔

ص137 لفظ ''لٹریری'' کی جگہ ''تحریری'' کر دیا ہے۔

ص137 پر ''شروکن اول'' لکھا تھا۔اب مرزا ابن حنیف نے ''شروکین اول'' کر دیا ہے۔

ص138 ملوہہ ''وسطی پنجاب کا نام تھا'' عنوان ہے اس کو مرزا ابن حنیف نے نظر ثانی کرتے ہوئے ملوہہ جنوبی پنجاب کا نام تھا'' درست خیال کیا ہے۔

ص139، 138 پر لفظ ماگان کو گامان لکھا ہے۔جو کہ میرا خیال ہے کہ کاتب کی غلطی ہے۔ اس کو مرزا ابنِ حنیف نے ماگان لکھا ہے۔

ص150 شروع کی یہ سطریں توجہ طلب ہیں۔

''اسی ملی یا ملوئی قوم کے نام پر یہ علاقہ ملوہہ کہلاتا ہو اس قوم کی باقیات میں سے ایک ملتان شہر ہے اور میرے نزدیک ملتان ملوہہ کا مرکزی مقام بھی تھا۔''

ان سطروں کے بارے میں مرزا ابن حنیف نے کچھ یوں کہا ہے:

''اگر اس وقت موجود تھا تو ہوسکتا ہے کہ ملتان ملوہہ کا مرکزی مقام بھی رہا ہو اور اس کا نام بھی ملتان ہو۔''

ص150 پر ہی اسی پیرا گراف میں ''سنسکرت بولنے والے یعنی آریہ اپنے دشمن ملوہہ (پاکستان) کے رہنے والوں کو ملیچھ کہتے تھے''

ان سطور کی تبدیل شدہ صورت یہ ہے۔ ''ابتدائی زبان سنسکرت بولنے والے یعنی آریہ اپنے دشمن خطے ملوہہ (پاکستان) کے رہنے والوں کو ملیچھ کہتے تھے۔''

آگے چل کر ایک جملہ تبدیل کیا ہے پہلی صورت یہ ہے ''اور پھر ملوہہ کے رہنے والے یعنی ''ملیچھ'' کا لفظ ہی حقارت، ناپاکی اور کراہت کی علامت بن کر رہ گیا'' تبدیل کرنے کے بعد صورت یوں ہے۔ ''اور وہ ملوہہ کے رہنے والوں کے لئے مخصوص لفظ ملیچھ حقارت، ناپاکی اور کراہت کی علامت بن کر رہ گیا''

آگے ایک اور جگہ وسطی پنجاب کی جگہ جنوبی پنجاب لکھا گیا ہے۔

''پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی یہ نام مروج رہا ہو۔''

اس پر مرزا ابن حنیف نے نظر ثانی کرتے ہوئے یوں کہا؛ ''کوئی وجہ نہیں کہ'' اس کو ختم کر دیا اور اس جگہ ''شاید'' کا لفظ درج کر دیا ہے۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا پانچواں باب ''جلیل پور کی اہمیت اور ملتان ملوہہ وسطی پنجاب کے علاقے میں 5 ہزار سال قبل تہذیبی صورتحال'' کے عنوان سے منتخب کیا گیا ہے اور اسی حوالے سے اس کی اہمیت کو مختلف دلائل اور نظریات کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔ پاکستان کی قدیم تاریخ اور تہذیبی ارتقاء میں ملتان و ہڑپہ کے علاقے یعنی جنوبی پنجاب کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ خطہ اپنی تجارتی سیاسی اور عسکری مرکزیت اور اہمیت کے سبب ہزاروں سال پہلے بھی پاکستان میں اپنی مخصوص و منفرد حیثیت کا حامل تھا۔ یہ وہ خطہ تھا جہاں چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں آباد تھیں۔ یہ وہ خطہ تھا جہاں ہڑپہ سے کوئی 50 میل کے فاصلے پر عبدالحکیم کے قریب وہ بستی بھی تھی جس کا نام جلیل پور ہے اور جہاں کھدائی کے دوران پانچ برس پہلے آثار برآمد ہوئے ہیں۔ یہ وہ خطہ تھا جس کے دریاؤں سندھ، راوی، چناب وغیرہ کے پانیوں پر دور دور تک تجارتی کشتیاں چلتیں اور مال و اسباب لے کر جاتیں۔ قدیم عراقیوں نے اپنی بہت ساری اقتصادی، مذہبی اور ادبی تحریروں میں ''ملوہہ'' کے نام سے اس علاقے یعنی جنوبی پنجاب کا ذکر کیا ہے یہی وہ علاقہ تھا جہاں سکندر اعظم نے پاکستان پر اپنے حملے اور قیام کے دوران سب سے زیادہ تباہی مچائی۔ الغرض مرزا ابن حنیف نے اس باب میں ہر عنوان پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس باب کی

نظر ثانی کے دوران اُن کو کوئی ایسی بات نامناسب معلوم نہیں ہوتی جس کو وہ کتابت سے خارج کر سکیں۔ یا اُن کو اس حوالے سے مزید کوئی خاص معلومات کا ذخیرہ بھی دستیاب نہ ہو سکا ہو گا اس لئے انہوں نے اس باب میں کوئی خاطر خواہ اضافہ بھی نہیں کیا۔

''سات دریاؤں کی سرزمین'' کا چھٹا باب ''ملتان - ملوہہ (وسطی پنجاب) کا اہم شہر'' کے عنوان سے سامنے آتا ہے۔ اس میں پچھلے ابواب کی طرح ''وسطی پنجاب'' کی جگہ ''جنوبی پنجاب'' کر دیا گیا ہے۔ اس باب کا پہلا عنوان ''ملتان کی قدامت'' صفحہ 216 پر ہے مرزا ابن حنیف نے اس میں مندرجہ ذیل جملے کو کتاب سے خارج کر دیا ہے۔

''اور جب سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے بھی ملوہہ، دلمون، ماگان یعنی پورے پاکستان کے چند اہم ترین شہروں میں سے تھا۔''

اسی صفحہ 216 کی آخری چند سطور بھی کتاب سے نکال دی گئی ہیں۔

وہ سطور کچھ یوں ہیں۔ ''نہ صرف پاکستان بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بھارت اور بنگلہ دیش میں بھی اتنا بڑا اور اہم اور کوئی شہر آج ایسا نہیں ہے جو ملتان کی سطرح پانچ چھ ہزار برس سے نہ صرف برابر آباد چلا آرہا ہو بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت اور ہر طرح کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا ہو۔''

ص217 کے پورے صفحے کو قلم زد کر دیا ہے اور اس کے بارے میں مرزا ابن حنیف نے کچھ یوں کہا ہے۔

''اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد___ قلعہ اور کبوتر منڈی کی بورنگ کے نتائج کا ذکر کہ ہندو پریڈ سے قبل کے ملتان کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مجھے اب بھی گمان ہے کہ اس شہر کے نیچے کسی نہ کسی جگہ پہلی آبادی ابتدائی ہڑپائی دور یا شاید اس سے بھی قبل ہاکڑہ عہد میں بسائی ضرور گئی تھی۔ اس کے آثار بی بی پاک دامن کے مزار کے علاقے کے نیچے ہوں۔''

ص218 کا پہلا پیرا گراف مرزا صاحب نے قلم زد کر دیا ہے اور اس کے بارے میں کہا ہے

''سکندر کے ملتان آنے کا کوئی ثبوت (آثار یاتی) نہیں ہے۔''

ص219 پر بھی مرزا ابن حنیف توجہ دیتے ہیں اور انہوں نے اس میں بھی ممکنہ حد تک تبدیلیاں کیں ہیں۔

''ایک ہی اور بہت بڑا شہر ضرور ہونا چاہیے۔''

اس جملے کو انہوں نے بدل دیا ہے اور اسے وہ اب کچھ اس صورت میں لکھتے ہیں

''کم از کم دو تین شہر ضرور ہونے چاہیے تھے۔''

''چنانچہ مجھے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک بہت بڑا عظیم شہر یقیناً تھا اور وہ تھا ملتان۔''

اس کی تبدیل شدہ شکل یوں ہے ''چنانچہ ثبوت ہونے کے باوجود مجھے اس بات میں ذرا بھی

شبہ نہیں ہے کہ اُن دونوں کے درمیان اور بھی عظیم شہر موجود تھے اور ان کی حیثیت عراق میں قدیم سومیری ریاستوں جیسی تھی۔''

مرزا ابن حنیف نے ضرورت محسوس کرتے ہوئے اگلی چند سطور کو قلم زد کر دیا ہے۔ (اور یوں تو میرے خیال میں اوچ شریف کے علاوہ شہر روہڑی اور موجودہ حیدر آباد کے قریب بھی ہڑپائی دور میں بڑے شہر ہونے چاہئیں) اور اگلا جملہ ''ملتان جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے موہنجوڈارو اور ہڑپہ سے بھی زیادہ اہم جگہ آباد ہے۔'' مرزا ابن حنیف نے کتاب میں شامل رکھا ہے۔

''میری اس تمام بحث'' سے لیکر ''اور قصبے آباد تھے۔'' تک مرزا ابنِ حنیف نے جملے کتاب سے خارج کر دیے ہیں۔

اس کے بعد ''ملتان کو تجارتی، عسکری، سیاسی اور مرکزی اہمیت اس وقت بھی حاصل تھی'' خارج کر دیا ہے اس کی جگہ انہوں نے کہا ہے

''اپنے محل وقوع کے سبب کیا یہ ممکن نہیں کہ ملتان بھی اس وقت چھوٹے یا بڑے شہر کی صورت میں موجود رہا ہو۔''

ص219 پر ہی آخری پیراگراف ''اور اب میں ان حضرات کی معصومانہ'' سے لیکر ''کوئی گنجائش نہیں ہوا کرتی'' تک کو نامناسب خیال کرتے ہوئے مرزا ابنِ حنیف نے خارج کر دیا ہے۔

اسی باب کا ایک عنوان ''ملتان کی جغرافیائی اہمیت'' ہے اس عنوان کا جائزہ لیتے ہوئے مرزا ابن حنیف نے پہلے پیراگراف کا پہلا جملہ ''جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں'' سے لیکر ''انتہائی اہم مقام تھا'' ختم کر دیا ہے اس کے بعد جملہ یوں شروع کیا ہے۔ ''اگر واقعی ملتان ان دنوں موجود تھا تو ہوسکتا ہے کہ اپنے محل وقوع کے پیش نظر تجارتی، تہذیبی، سیاسی، عسکری اور اقتصادی خوشحالی کے لحاظ سے اسے شاید ہڑپہ اور موہنجوڈارو پر بھی تقدیم حاصل رہا ہو۔''

اس کے بعد کا پیراگراف وسطی پنجاب (ملوہہ) کے اہم علاقے'' سے لیکر نمایاں حیثیت اختیار کر گیا تھا'' مرزا صاحب نے ختم کر دیا ہے۔

2[illegible] کی آخری سطور کچھ یوں ہیں ''مذکورہ راستوں کے ذریعے تاریخی اور ماقبل تاریخی ادوار میں تاجر کے قافلے ملتان آتے جاتے رہے تھے۔ آبی شاہراہوں اور خشکی کے راستوں کے ذریعے آمدورفت اس کے علاوہ تھی۔'' مرزا ابن حنیف ان سطور کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

''ملتان ضرور رخ کرتے ہوں بشرطیکہ یہ اس زمانے میں آباد ہو۔ ایک اور راستہ بلوچستان کے ژوب کے علاقے باوہوا کے قریب پہاڑوں میں پاکستان میں داخل ہوتا تھا۔''

ص221 پر پہلا پیراگراف قابل غور ہے۔ اس میں مختلف جگہ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس پیراگراف کی تبدیل شدہ صورت یہ ہے

''اگر ملتان ان قدیم ادوار میں نہ صرف اہم ترین آبی بلکہ بری تجارتی شاہراہوں پر واقعی آباد ہو چکا تھا تو یہ شہر جنوبی پنجاب (ملوہہ) بلکہ پورے پاکستان کے ہی قلب میں واقع ہوئے اور اپنے اس جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت کی وجہ سے تقریباً پورے پاکستان کی دریائی اور کافی حد تک بری تجارت کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں رہا ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی ہڑپائی تہذیب کے دور'' یعنی اب سے ساڑھے چار ہزار برس قبل سے لیکر (1500ق۔م) میں پاکستان پر آریائی حملے یعنی اب سے ساڑھے تین ہزار برس قبل تک بھی ملتان کو تجارتی اور سیاسی بالادستی حاصل رہی ہو۔''

ص221 پر ہی ''چنانچہ اس کی مرکزی اور مقتدر حیثیت کے باعث اسے نہ صرف ملوہہ (وسطی پنجاب) بلکہ پاکستان کے تمام پرانے ہم عصر شہروں میں ممتاز ترین درجہ حاصل ہو گیا۔''

ان مندرجہ بالا جملوں کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے مرزا صاحب نے انہیں قلم زد کر دیا ہے۔

صفحہ 221 کی ان سطور پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔

''ملتان ایک خاص کردار ادا کرتا رہا ہے اور ملتان ہزاروں برس پہلے ملوہہ (وسطی پنجاب) کی انتہائی اہم بندرگاہ تھا۔''

ان سطور کو مرزا ابن حنیف نے کچھ اس طرح تبدیل کر دیا ہے۔

ملتان اگر موجود تھا تو ایک خاص کردار ادا کرتا رہا اس طرح قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ملتان ہزاروں برس پہلے ملوہہ (جنوبی پنجاب) کی انتہائی اہم دریائی بندرگاہ تھی۔''

اس کے بعد (یہاں سے آگے اوچ شریف کو بھی کم و بیش یہی مقام حاصل تھا) انہوں نے اس جملے کو نامناسب خیال کیا ہے اور باب سے کاٹ دیا ہے۔

ص222 ملتان کے مختلف نام اور اس شہر سے وابستہ قدیم روایات'' کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے تبدیلی یوں کی ہے۔ ''پاکستان اور ملتان کے مختلف نام'' باقی عنوان ختم کر دیا ہے۔

ص227 پر موجود یہ پیراگراف ''بہر حال رگ وید میں جو شہر کے نام آئے ہیں سے لیکر زیادہ مدت سے چلا آرہا ہے۔''

ضرورت نہ ہونے کی صورت میں وہ اب اس کو کتاب میں شامل نہیں کرتے۔ دوسرے پیراگراف کی پہلی ''پاکستان پر پہلا معروف بیرونی حملہ آریاؤں کا تھا۔'' اس کے بارے میں مرزا ابنِ حنیف یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔ ''پاکستان میں بیرونِ ملک سے پہلی معروف آمد آریاؤں کی تھی۔''

اسی پیراگراف کی اگلی سطر میں تبدیلی کرتے ہیں۔ سطر کی پہلی صورت یوں ہے۔ ''ان وحشی، خونخوار، برخودغلط اور آوارہ گرد لوگوں نے پاکستان کی رفیع الشان اور خیرہ کن بسی بسائی تہذیب کو بری طرح تہس نہس کیا۔''

تبدیل شدہ سطر یوں ہے۔ ''ان وحشی اور آوارہ خرام لوگوں نے پاکستان کی رفیع الشان اور

خیرہ کن بسی بسائی تہذیب کو بری طرح تہس نہس کر دیا ہے۔''

ص228 پر ایک جگہ لفظ مکروہ استعمال ہوا ہے۔ اس کو وہ ''افسوسناک'' میں بدل دیتے ہیں۔

ص228 کے اختتام پر آخر میں اس طرح لکھتے ہیں ''لیکن ایک بات پھر ذہن میں رکھتے چلئے کہ یہ سب اسی صورت میں ہوا ہوگا جب ملتان ہڑپائی دور میں واقعی آباد تھا۔''

ص230 پر ایک موجودہ سطر کو اس طرح بدلتے ہیں

''رگ وید کی چھٹی کتاب کے اسی اہم ستائیسویں گیت میں ورشکھ نامی ایک سرکردہ پاکستانی کردار کا بھی ذکر آیا ہے۔''

چھٹے باب کا جائزہ لیں اور انہوں نے جو اس باب پر نظر ثانی کرنے کے بعد تبدیلیاں کی ہیں اُس پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ عنوان کے مطابق جب بعد میں انہیں معلومات کا ذخیرہ دستیاب ہوا تو اُس معلومات کی روشنی میں انہوں نے خاطر خواہ تبدیلیاں کیں۔

''سات دریاوں کی سرزمین'' کے ساتویں باب کا عنوان ''ملتان (ملوہہ) کے ملی قبائل'' ہے۔ یہ باب ملی قبائل کے لئے مخصوص ہے جو نامعلوم زبانوں سے وسطی پنجاب میں آباد تھے اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اُن کے نام پر ہی گزرے روز میں اس علاقے کا نام ملوہہ رہا ہو۔

اس باب میں انہوں نے غور کے دوران کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس باب سے اور اس میں موجود کام اور نظریات سے وہ متفق نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کے آخر میں مرزا صاحب نے کتابیات کی فہرست بھی شامل کی۔ ان سب باتوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ مرزا ابنِ حنیف نے کام خوب دلجمعی سے کیا اور کتاب مکمل ہونے اور منظر عام پر بھی آ جانے کے بعد وہ اس کام سے عہدہ برآ نہیں ہوتے بلکہ جیسے جیسے معلومات کا خزانہ وہ پاتے ہیں اُسی کے مطابق کتاب میں کمی بیشی کرتے چلے جاتے ہیں۔

سات دریاؤں کی سرزمین'' میں مرزا صاحب کا اسلوب صاف سادہ اور رواں ہے مرزا ابنِ حنیف نے کتاب لکھتے ہوئے ایسا جاذب اسلوب کا انتخاب کیا ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا اور شاید ایسی تحقیقی موضوعات پر مبنی کتب کا اسلوب ایسا ہی ہونا چاہیے تاکہ قاری کی توجہ اس موضوع سے ہٹنے کی بجائے بڑھتی جائے اور ساتھ ساتھ دلچسپی اور انہاک کا عنصر بھی بڑھتا جائے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب بے حد اہمیت کی حامل ہے یہ نہ صرف بیرونی محققین کی تحقیق سے ہمیں متعارف کروا رہی ہے بلکہ اس سے ڈاکٹر محمد رفیق مغل جیسے شہرت یافتہ محقق کے نظریات سے بھی واقفیت حاصل ہو رہی ہے اس اعتبار سے یہ کتاب اردو زبان میں تحقیقی کتابوں میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

☆☆☆

رضی الدین رضؔی

مرزا صاحب۔ احوال پہلی اور آخری ملاقاتوں کا

لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ شہرِ علم و آگہی رکھنے والوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارا یہ وطیرہ رہا ہے کہ ہم ہر قلم کار کی موت کو ادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہیں۔ تعزیتی بیانات اور تقریبات میں کہا جاتا ہے کہ ان صاحب کی موت کے نتیجے میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ یہ جملہ اتنی مرتبہ اور اتنا بے موقع استعمال ہوا کہ اپنے معنی ہی کھو بیٹھا اور پھر جب مرزا ابنِ حنیف کا انتقال ہوا اور ادب کو واقعی ناقابلِ تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تو ہم اس سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا لکھیں؟ ادب کے ناقابل تلافی نقصان والا جملہ تو اس سے پہلے بھی بارہا استعمال ہو چکا ہے اور ایسے ایسے لوگوں کے لیے بھی استعمال ہو چکا ہے کہ جو زندہ تھے تو بھی ادب کی توقیر میں اضافے کا باعث نہ تھے اور جب چلے گئے تو بھی کاروبارِ ادب قطعاً متاثر نہ ہوا۔ سو قارئین محترم اب یہی گھسا پٹا اور روایتی سا جملہ مرزا ابنِ حنیف کے لیے تو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا صاحب تو بہت غیر روایتی انسان ہے۔ ہماری روایات تو اب کیا سے کیا ہو چکی ہیں۔ یہ روایت بن چکی ہے کہ ادیب اور شاعر مطالعے سے (بلکہ بسا اوقات تو لکھنے سے بھی) گریز کرتے ہیں۔ یہ روایت بن چکی ہے کہ قلم کار کچھ نہ کر کے بھی بہت کچھ کر لینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اوروں کا راستہ روک کر خود آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جاہ و منصب کے حصول کے لیے ذلت کا راستہ اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ شہرت کے لیے تمام ذرائع اور اعزازات کے حصول کے لیے تمام تعلقات استعمال کرتے ہیں۔ مرزا صاحب میں تو ایسی کوئی بھی ''خوبی'' نہیں تھی۔ انہوں نے تو مروّجہ روایات سے خود کو ہمیشہ الگ تھلگ رکھا تو پھر ان کی موت پر کیا لکھا جائے۔

مرزا ابنِ حنیف کی زندگی مسلسل محنت سے عبارت تھی۔ کوئی پچیس برس قبل ہم نے انہیں پہلی بار ''امروز'' کے دفتر میں دیکھا تو وہ سر جھکائے کام میں منہمک تھے، خبروں کا ایک انبار ان کے سامنے تھا اور موت سے ایک ماہ قبل جب ان سے آخری ملاقات ہوئی تو بھی کتابوں کا ایک ڈھیر ان کے سامنے تھا۔ مرزا صاحب سے پہلی ملاقات ''امروز'' کے دفتر میں ہوئی تھی۔ ہم اپنی غزل شائع کرانے کے لیے اقبال ساغر صدیقی کے پاس گئے تو انہوں نے ہمیں مرزا ابنِ حنیف کے پاس بھیج دیا۔ شاکر حسین شاکر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر پہنچے تو سامنے والے کمرے میں مرزا صاحب کام میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ حنیف چودھری بیٹھے تھے۔ مرزا صاحب نے ایک نظر غزل پر ڈالی اور پھر ہمیں دیکھا۔

''بیٹا یہ غزل آپ نے لکھی ہے؟'' انہوں نے اتنے دھیمے انداز میں پوچھا کہ ہم بہ مشکل ان کی آواز سن پائے۔

’’جی میں نے لکھی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ انہوں نے غزل اپنے پاس رکھ لی۔ شائع ہو گی یا نہیں اس بارے میں کچھ نہ بتایا۔ ایک ہفتہ تو غزل شائع نہ ہوئی لیکن اگلے ہفتے مرزا صاحب نے اسے شائع کر دیا۔ بس غزل چھپنے کی دیر تھی کہ ہم اسی روز ایک اور غزل لے کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا، پہچاننے کی کوشش کی اور پھر خاموشی سے کام میں مگن ہو گئے۔ ہم نے سلام کیا تو عینک اُتار کر میز پر رکھی، ہمیں بیٹھنے کو کہا اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ کچھ دیر خاموشی برقرار رہی پھر وہ ہماری جانب متوجہ ہوئے۔

’’فرمائیں۔ کیسے آئے ہیں؟‘‘

’’مرزا صاحب آج آپ نے ہماری غزل شائع کی ہے اور ہم اب ایک اور غزل لے کر حاضر ہوئے ہیں۔‘‘

پھر جیسے انہیں سب کچھ یاد آ گیا۔ اب تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ’’آپ کیا کرتے ہیں؟ کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں؟ پڑھائی میں کیسے ہیں؟ کالج باقاعدگی سے جاتے ہیں یا نہیں؟ سائنس کے مضامین پڑھتے ہیں تو پھر شاعری کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو اتنے مشکل سبجیکٹس کے ساتھ شاعری کا ٹائم کیسے مل جاتا ہے؟‘‘ یہ اور ایسے بہت سے سوالات تھے جو مرزا صاحب نے اس پہلی نشست میں ہی کر ڈالے۔ پھر ایک طویل لیکچر شروع ہوا۔

’’دیکھو بیٹا! پڑھائی پر توجہ دو۔ پہلے تعلیم اور بعد میں شاعری۔ یہ شعر و یر کہنے اور مضامین لکھنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔ ارے بھئی تم سائنس کے سٹوڈنٹ ہو کر شاعری کرتے ہو۔ میں تو تمہاری غزلیں نہیں چھاپوں گا۔‘‘ اس روز مرزا صاحب نے ہمیں بہت مایوس کیا۔

’’عجیب بات ہے یار! نصیحتیں کرنے کے لیے گھر والے کیا کم تھے کہ مرزا صاحب نے بھی پڑھائی کی تلقین شروع کر دی۔‘‘ شاکر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

’’ہاں یار یہ تو مرزا صاحب نے بہت عجیب باتیں کیں۔ دیکھو ناں ان سے اچھی تو نوشابہ باجی ہیں خاموشی سے کہانیاں اور نظمیں چھاپ دیتی ہیں۔ کبھی پڑھائی کا نہیں پوچھتیں۔‘‘ ہم دونوں انتہائی مایوسی کے عالم میں امروز کی سیڑھیاں اُتر آئے۔ مرزا صاحب نے ہماری غزلیں چھاپنا بند کر دیں۔ ہمیں اپنی شاعری کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

ایک دو مرتبہ تو یوں ہوا کہ ہم بچوں کے صفحے کے لیے کوئی تحریر دینے نوشابہ نرگس کے پاس گئے تو مرزا صاحب کی ہم پر نظر پڑ گئی۔ ’’بیٹا آپ کالج سے اُٹھ کر یہاں آ گئے ہیں ناں ___ ؟ جب تک امتحانات نہیں ہو جاتے میں آپ دونوں کو دوبارہ یہاں نہ دیکھوں۔‘‘ انہوں نے شاکر کے تو باقاعدہ کان مروڑ دیئے۔

اب ہم کبھی ’’امروز‘‘ کے دفتر جاتے تو کوشش کرتے کہ مرزا صاحب کی ہم پر نظر نہ پڑے۔ غزلوں اور مضامین کی اشاعت پر یہ پابندی زیادہ عرصہ جاری نہ رہی۔ ایک روز اخبار دیکھا تو اس میں ہماری غزل چھپی ہوئی تھی۔ ہماری خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ مبارک مجوکہ کا پیریڈ چھوڑ کر انور جمال کا کالم ’’نوائے

وقت‘‘ کو دینے کے بہانے کالج سے نکلے اور شکریہ ادا کرنے سیدھے مرزا صاحب کے پاس جا پہنچے۔

’’مرزا صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔‘‘

’’کس بات کا بیٹا؟‘‘ انہوں نے حیرت سے دریافت کیا۔

’’آپ نے میری غزل چھاپ دی ہے۔‘‘

’’ارے!۔۔۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ میں نے تو تمہاری غزل نہیں چھاپنا تھی۔ چلو کوئی بات نہیں لیکن بیٹا ہمیشہ ایسے نہیں چلے گا۔ پہلے پڑھائی اور بعد میں کچھ اور۔ بس یہ خیال رکھنا۔‘‘

پھر اس کے بعد مرزا صاحب گاہے گاہے ہماری تحریریں چھاپتے رہے۔ پڑھائی کی تلقین بھی جاری رہتی۔ ادبی محفلوں میں ملتے تو کان بھی مروڑتے۔

’’دیکھیں ساغر صاحب! یہ آپ کے امانت علی اور خیانت علی پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے۔ نوشابہ! آپ بھی ان کی کہانیاں زیادہ نہ چھاپا کریں۔‘‘

لیکن یہ ان کا طریقہ تھا حوصلہ افزائی کا۔ وہ یہ بھی کہتے رہے کہ میں تمہاری غزلیں اور مضمون نہیں چھاپوں گا اور ساتھ ساتھ چھاپتے بھی رہے۔ کیسا اچھوتا انداز تھا تربیت کا۔ ہم ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں قدم قدم پر ایسے بزرگوں کی شفقت اور رہنمائی میسر آئی کہ جس سے آج کی نسل محروم ہے۔

مرزا صاحب علم کا سمندر تھے۔ قدیم تہذیبیں، آثار اور قدیم داستانیں ان کا موضوع تھیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر پاکستان میں چند ہی لوگ کام کر رہے ہیں۔ مرزا ابنِ حنیف کو تحقیق کے اس میدان میں اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ اُجڑی ہوئی بستیاں، مدفنوں سے دریافت ہونے والے ٹوٹے ہوئے برتن، ٹھیکریاں اور پتھر ان کا کل اثاثہ تھا۔ قدیم تہذیبوں کے بارے میں کسی نے بھی کام کرنا ہوتا تو اسے بنیادی معلومات مرزا ابنِ حنیف سے ہی ملتی تھیں اور وہ ان معلومات تک رسائی میں ہر ممکن تعاون کرتے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ نے دریائے گھاگھرا کی اُجڑی ہوئی تہذیب کے حوالے سے ناول ’’بہاؤ‘‘ تحریر کرنے کا قصد کیا تو سب سے پہلے مرزا صاحب سے ہی رابطہ کیا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ مرزا ابنِ حنیف نے گھاگھرا کی تہذیب اور اس دور کے لوگوں کے رہن سہن کے حوالے سے جو معلومات فراہم کیں وہی ان کے ناول کی بنیاد بنیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے تو خیر اعتراف کر لیا مگر ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے مرزا ابنِ حنیف کی رہنمائی میں اپنا کام تو مکمل کر لیا مگر اس کا اعتراف کبھی نہ کیا لیکن مرزا ابنِ حنیف ان ’’معمولی‘‘ باتوں پر کبھی توجہ نہ دیتے تھے۔ وہ تو ایک درویش تھے۔ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر کام میں مگن رہتے تھے۔ ایک جنون اور ایک لگن تھی جو انہیں منہمک رکھتی تھی۔ بیماری کے عالم میں اور عمر کے آخری حصے میں بھی تھکاوٹ کا احساس نہ ہونے دیتی تھی۔ وہ ایک مثال تھے خودداری اور انا کی۔ تحمل اور ضبط کی۔ زندگی میں چند ہی لوگ ایسے ملتے ہیں (اور ایسے لوگ ہر کسی کو نہیں ملتے) جنہیں آپ کبھی کسی کی برائی کرتے نہیں دیکھتے۔ جو سراپا خیر ہوتے ہیں، ہر وقت تشکر کی کیفیت میں

رہتے ہیں۔ اپنے حال میں مگن اور مطمئن رہتے ہیں اور جن کے بارے میں کوئی اور بھی کبھی کوئی شکوہ یا گلہ نہیں کرتا۔ میں نے اب تک ایسی دو ہی شخصیات دیکھی ہیں کہ جن کی زبان سے کبھی کسی کے خلاف کوئی جملہ نہ سنا۔ ان میں سے ایک حزیں صدیقی مرحوم تھے اور دوسرے مرزا ابنِ حنیف۔ مرزا صاحب سراپا محبت تھے۔ میری طرح ان کے ہر ملنے والے کو یہ عویٰ ہوگا کہ وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔

١٨ جون کی تپتی دوپہر جب میں اور شاکر حسین شاکر ان سے ملنے گئے تو ہمیں معلوم تھا کہ شاید ہماری ان کے ساتھ یہ آخری ملاقات ہے۔ حنیف چودھری صاحب کی زبانی ہمیں ان کی علالت کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ہم ان سے ملنے گئے تو ہمیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس بیماری کی حالت میں بھی خود دروازہ کھولنے آئیں گے۔ مرزا صاحب نے دروازہ کھولا تو یک دم بیس پچیس برس پہلے کا منظر نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جب ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ یوں لگا جیسے ابھی وہ آگے بڑھ کر میرا یا شاکر کا کان مروڑیں گے اور کہیں گے ''بیٹا تم پھر کالج کا پیریڈ چھوڑ کر آ گئے ہو۔ میں تمہاری غزل نہیں چھاپوں گا۔'' مرزا صاحب ہمیں سامنے دیکھ کر کِھل اُٹھے۔ ہاتھ تھاما اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں بہت سے کارٹن تھے جن میں کتابیں پیک کی جا رہی تھیں۔ فرش پر کچھ ٹھیکریاں تھیں، کچھ پتھر تھے، ایک دو مورتیاں تھیں اور ٹوٹے ہوئے برتن تھے۔ وہ سب کچھ جو مرزا صاحب قلعہ کی کھدائی کے دوران نکلنے والے گارے سے ڈھونڈ کر لائے تھے۔ وہ یہ سب کچھ زکریا یونیورسٹی کو عطیہ کر رہے تھے۔ مرزا صاحب کو خود بھی یقین ہو چلا تھا کہ وہ اب زیادہ نہیں جی پائیں گے وگرنہ وہ ان ٹھیکریوں پتھروں اور کتابوں کو بھلا خود سے کیسے جدا ہونے دیتے۔ اُس روز اُنہوں نے ہمارے ساتھ ڈھیروں باتیں کیں۔ اپنی پہلی کتاب کی اشاعت کا احوال سنایا اور اس کتاب کی اشاعت پر مکتبہ کارواں کے چودھری عبدالحمید نے انہیں جو ٣٠٠ روپے دیئے تھے انہیں کوئٹہ تک لے جانے میں انہیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا (وہ ان دنوں کوئٹہ رہتے تھے) یہ سب باتیں انہوں نے تفصیل کے ساتھ بتائیں۔

''بیٹا مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے تم دونوں کو ٢٥ سال بعد بھی ایک ساتھ دیکھ کر۔'' انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ یہ وہ ہاتھ تھے جنہوں نے عمر بھر قلم کو وسیلۂ رزق بنائے رکھا۔ کمزور تو وہ پہلے ہی تھے اب انتہائی کمزور ہو چکے تھے کہ بس ہڈیاں تھیں اور ان پر ماس باقی رہ گیا تھا لیکن یہ ہاتھ اب بھی بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ ان کی گرفت اب بھی مضبوط تھی۔

''بس میں چاہتا ہوں کہ اتنی مہلت مل جائے کہ میں نے جو دو چار کام شروع کر رکھے ہیں وہ مکمل ہو جائیں۔''

لہجہ تو ان کا ہمیشہ سے دھیما ہوتا تھا۔ پہلی ملاقات میں بھی ان کی بات توجہ دے کر سننا پڑتی تھی اور اب آخری ملاقات میں تو ان کی آواز بہت ہی دھیمی ہو چکی تھی۔ میں ان کے بہت پاس بیٹھا تھا اور کان ان کے قریب کر کے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ آواز کہ جسے مجھے پھر کبھی سننا نصیب ہی نہ ہونا تھا۔

ہم جب پہلی بار کسی سے ملتے ہیں تو ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا کہ ہمیں کبھی اس سے آخری بار

بھی ملنا ہوگا۔ پہلی ملاقات میں کسے معلوم ہوتا ہے کہ آخری ملاقات کب اور کس حال میں ہوگی اور آج ہم مرزا صاحب سے آخری بار مل رہے تھے۔ پہلی ملاقات کے موقع پر بھی میں اور شاکر اکٹھے تھے اور آج آخری ملاقات میں بھی ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے گواہ تھے۔ منظر نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ اچکن میں ملبوس مرزا صاحب سائیکل پر کتاب نگر کے سامنے کیسے اُترتے تھے یا بیکن بکس پر ملتے تھے اور کیسے وہ خبروں کے انبار میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتے تھے اور ہم کئی بار ان سے نظر بچا کر نوشابہ نرگس کو کہانیاں دے آتے۔

''مرزا صاحب ایک آٹوگراف دیجیے۔''

''بیٹا کیا کرو گے؟''

''اخبار میں چھاپوں گا۔''

''ہاں کاغذ اور قلم دو۔''

کاغذ شاکر نے سامنے میز پر پڑی ان کی ایک نوٹ بک سے نکالا قلم میں نے دیا۔ مرزا صاحب نیم دراز تھے۔ سیدھے ہو کر بیٹھے۔ ''بولو کیا لکھوں۔''

''مرزا صاحب میں کیا بولوں۔ آٹوگراف تو آپ نے دینا ہے۔''

''نہیں تم بتاؤ ناں۔ جو کہتے ہو لکھ دیتا ہوں۔''

''بس مرزا صاحب کچھ بھی لکھ دیں۔ آپ تو جو لکھیں گے ہمارے لیے تبرک ہوگا۔''

انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے گھورا۔ شاید سمجھ گئے تھے کہ میں آٹوگراف کیوں لے رہا ہوں۔ ایک پرچھائیں سی ان کے چہرے پر آئی اور انہوں نے کاغذ پر دو سطریں لکھ دیں۔ ممکن ہے یہی ان کی آخری تحریر ہو۔ انہوں نے لکھا ''نوجوان ملتان اور اس کے ثقافتی علاقے کے بارے میں بھی لکھنے کی طرف توجہ دیں۔ بہت گنجائش موجود ہے۔''

پچیس سال تک ہمیں نصیحتیں کرنے والے مرزا ابنِ حنیف آٹوگراف کی شکل میں ہمیں وصیت کر رہے تھے۔ وہ ضد کر کے دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئے سامنے لان میں پڑا ایک بڑا سا پتھر دکھایا ''یہ پتھر بھی قلعہ کی کھدائی سے ملا تھا۔ دیکھو اس دور کے لوگ کتنے مضبوط پتھر استعمال کرتے تھے۔'' آخری ملاقات کے آخری لمحات میں بھی وہ آثاریات کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔

''اچھا بیٹا جاؤ۔ کبھی کبھار آ جایا کرو۔''

''نہیں مرزا صاحب ایسے نہیں۔'' میں نے سر جھکا کر اپنا کان ان کے آگے کر دیا۔

مرزا صاحب کی آنکھوں میں ایک چمک آئی۔ جیسے سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ انہوں نے پہلے میرا اور پھر شاکر کا کان مروڑا اور ہنس کر بولے ''تم جو مرضی کر لو۔ میں تمہاری غزلیں نہیں چھاپوں گا۔''

اس دفعہ مرزا صاحب نے صرف ڈراوا نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

شوکت نعیم قادری

ابنِ حنیف۔ چند یادیں

لفظ 'دوستی' ایک خوب صورت احساس کا نام ہے اگر ہم اِس لفظ کے صوتی آہنگ پر غور کریں تو یہ لفظ ایک خاص نوع کی مٹھاس لیے ہوئے ہے۔ دوستی کے اپنے معیارات اور تقاضے ہوتے ہیں، جن پر پورا اُترنا کارِ دُشوار ہے۔ ساری گڑبڑ اُسی وقت شروع ہوتی ہے، جب دوست 'بھائی' بن جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں تو مولانا خواجہ الطاف حسین حالی جیسے حلیم الطّبع بزرگ بھی بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں:

آ رہی ہے چاہِ یُوسُف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

دوستی ایک طرزِ احساس، طرزِ فکر، حسنِ سلوک اور روّیے کا نام ہے۔ دوست تو دوست ہوتا ہے اُس کے لیے عمر، مذہب، قوم اور جنس کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔

مرزا ابنِ حنیف میرے سینئر دوست تھے۔ ۲۹/جولائی ۲۰۰۴ء کی صبح چھ بجے میرا یہ دوست مجھ سے بچھڑ گیا۔ محبی سیّد عامر سہیل نے sms کے ذریعے یہ خبر دی تو دل غم واندوہ کی اَتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ ماضی کا دریچہ وا ہوا اور بہت سی تصاویر ازخود ذہن کے پردے پر متحرک نظر آنے لگیں۔

اُن دِنوں، میں نے مرزا صاحب کا نام تو پہلے سے ہی سن رکھا تھا۔ ادبی اور تنقیدی نشستوں میں بھی انہیں دیکھ سُن چکا تھا مگر اُن سے ملنے کا نہ تو اتفاق ہی ہوا تھا نہ ہی حوصلہ۔ ۱۹۹۱ء میں میری اُن سے پہلی بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ مرحوم روزنامہ 'امروز' کے بعد، وہ ملتان پوسٹ گریجوایٹ کالج، سے بہ حیثیت منتظم منسلک ہو گئے تھے۔ اس کالج کی بنیاد ڈاکٹر علم دار بخاری نے رکھی تھی۔ اُن دنوں مَیں نے سبطِ حسن کی کتاب 'ماضی کے مزار' (مکتبہ دانیال، کراچی، بارنہم، جنوری ۱۹۹۶ء) بھی اور بہت سے سوالات ذہن میں کُلبُلا رہے تھے۔ سرما کی ایک سرد شام، وہ کالج کے ایک کمرے سے نکلے اور خاموشی سے سر جھکائے اپنے دفتر کی جانب چل دیے۔ اُس وقت وہ پتلون اور اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ بلب کی زردی مائل روشنی میں بھی، چشمے کے پیچھے اُن کی متفکر آنکھیں جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ میں آگے بڑھا اور سلام دعا کے بعد اپنا تعارف کرایا۔ پوچھنے لگے: ''بیٹے! آج کل آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟'' مرزا صاحب ایسے کتاب دوست، نئے ملنے والوں سے اِسی انداز میں تعارف حاصل کرتے تھے کیوں کہ اس سے ملنے والوں کا رجحانِ طبع کا علم بھی بہ آسانی ہو جاتا ہے۔

میں نے جواب دیا: ''سر! ابھی میں نے سبطِ حسن کی کتاب پڑھی ہے اور اس میں طوفانِ نوح سے متعلق باب نے مجھے فکری طور پر متاثر کیا ہے۔ (باب ۷ 'طوفانِ نوح کی اصل حقیقت'، صفحہ نمبر

۴۳۱-۴۳۷) اِس مضمون سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ طوفان ساری دنیا پر نہیں آیا تھا۔ کیا اس سے ایمان کو ٹھیس نہیں پہنچتی؟''

کہنے لگے: بیٹے! پہلی بات تو یہ ہے کہ ایمان کو اتنا کم زور نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی تحریر پڑھ کر متزلزل ہو جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُس زمانے کے لوگوں کے لیے تو وہ علاقہ ہی اُن کی پوری دنیا تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ تمام اساطیر اور تمام مذاہب میں اُس طوفان کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہے۔ اس لیے واقعے کی کوئی نہ کوئی حقیقت اور کوئی نہ کوئی بنیاد تو ضرور ہے۔''

اِس کے بعد مرزا صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا مگر ایک اور خاص ملاقات کے بعد یہ سلسلہ دوستی میں بدل گیا۔ یہ ۱۹۹۸ء کی بات ہے۔ میں حضرت مسیحؑ کے ایک حواری سینٹ تھامس (حضرت توما) سے متعلق جاننے کا مشتاق تھا۔ وہ ۵۲ء میں برِصغیر میں وارد ہوئے تھے اور ۷۲ء میں یہیں (مدراس کے ساحلی علاقے میں) شہید کر دیئے گئے۔ میں نے اِس ضمن میں مرزا صاحب سے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے، اس حوالے سے اُن کے پاس دو مضامین موجود ہیں مگر انہیں تلاش کرنا پڑے گا۔ مرزا صاحب کے پاس ۱۹۵۰ء سے ۲۰۰۴ء تک تقریباً دس ہزار تراشوں کا ایک منفرد اور نایاب انتخاب موجود ہے۔ مجھے یہ انتخاب دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ہم دونوں نے کئی دِنوں کی تگ و دو کے بعد دو انگریزی مضامین تلاش کر لیے۔ اِن میں سے ایک مضمون Nicholas Ashford کا تحریر کردہ ہے جو Times, London کی ۲۲/دسمبر ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا عنوان تھا "India remembers her first Christian"۔

اس کا ترجمہ میں نے ''برصغیر پاکستان و ہند اپنے پہلے مسیحی کی یاد سناتا ہے'' کے عناون سے کیا۔ جو بعد ازاں میرے ترتیب دیے ہوئے کتابچے 'چراغ دان' یکم جنوری ۱۹۹۹ء میں طبع ہوا۔ اس سلسلے کا دوسرا مضمون "History's firstever Christain King belonged to Pakistan" Morning News کی ۶/جنوری ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔

مرزا صاحب کے تتبع میں، مَیں نے بھی تراشوں کو ترتیب دینا شروع کیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں میری بڑی راہ نمائی کی اور عمدہ مشورے دیے۔ میں تراشے اپنے پاس محفوظ کرتا اور مرزا صاحب کے لیے بھی اُن کا عکس بنوالیتا جنہیں وصول کر کے وہ بہت ممنونیت کا اظہار کرتے۔

اوپر کہیں مرزا صاحب کی کتاب دوستی کا ذکر آیا ہے۔ اس حوالے سے مرزا صاحب کی محبت مثالی تھی۔ ایک دفعہ کسی نے اُن نے کہہ دیا کہ میرے پاس فلاں کتاب پڑی ہے۔ وہ یہ جملہ سُن کر ناراض ہوئے اور کہنے لگے: ''بھئی! کتاب کے لیے 'پڑی' کا لفظ غیر مناسب ہے آپ کہیے کہ کتاب میرے پاس رکھی ہے۔ ہمیشہ کتابوں کی تکریم کیجیے، اس سے یقیناً آپ کی تکریم میں بھی اضافہ ہوگا۔''

اگر کبھی وہ کسی سے کوئی کتاب مستعار لیتے تو دل و جان سے اُس کی حفاظت کرتے اور کتاب

میں ایک رقعہ لکھ کر رکھ دیتے کہ یہ کتاب فلاں شخص کی ملکیت ہے۔ اِس حوالے سے وہ کہا کرتے تھے:
''اگر میری آنکھیں بند ہو جائیں تو میرے اہلِ خانہ کو تو یہ علم نہیں ہوگا کہ یہ کس کی کتاب ہے اور وہ کتاب اُس شخص کو نہیں لوٹائیں گے۔ روزِ قیامت تو وہ شخص مجھ سے سوال کر سکتا ہے۔ اِسی لیے میں ایک رقعہ لکھ کر کتاب کے اندر رکھ دیتا ہوں۔''

کتابوں کی محبت کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب فلم بینی کا بھی بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ وہ خاص طور پر تاریخی یا مذہبی تاریخی فلموں میں دل چسپی رکھتے تھے۔ ایک دفعہ وہ محبی عامر سہیل کے ہم راہ میری یہاں تشریف لائے تو ہم نے مل کر ایک مذہبی تاریخی فلم Moses دیکھا۔ اس فلم میں حضرت موسیٰ کا کردار معروف اداکار Burt Lancaster نے ادا کیا۔ انہوں نے فلم انتہائی دل چسپی سے دیکھا اور وقفے وقفے سے ماہرانہ رائے کا اظہار بھی کرتے جاتے۔ فلم کے اختتام میں نے مرزا صاحب نے کہا: ''مرزا صاحب! بہت سے لوگ ایسی مذہبی تاریخی فلمیں دیکھتے سے احتراز کرتے ہیں کہ اِس سے اُن کا ایماں خراب ہوتا ہے۔'' فرمانے لگے: ''بھئی! ایمان ایسا کم زور نہیں ہونا چاہیے کہ ایک فلم ہی دیکھ کر Mummy دیکھا جو انہوں نے انتہائی دل چسپی سے دیکھا اور کہا: ''بھئی! اس میں جو Book of Dead بنائی گئی ہے وہ ہرگز اتنی خوب صورت نہ تھی۔ یہاں انہوں نے اِسے Glamouize کر دیا ہے۔''

عامر سہیل کے یہاں ہی ایک اور فلم دیکھنے کا ذکر خالی از دل چسپی نہیں ہے۔ وہ National Geographic کا ایک دستاویزی فلم تھا۔ اُس فلم میں ایک ہَرمِ مصر کے خفیہ کمرے کا پتہ لگانا تھا۔ اُس کے لیے remote cameras استعمال کیے گئے تھے (یہ فلم مرزا صاحب کے لیے ریکارڈ بھی کیا گیا) فلم کے دوران یا دورانِ وقفہ اُن کی بے چینی اور اشتیاق دیدنی تھا۔ وہ ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے ''ایسا Suspence بھرا فلم شاید ہی اِس سے پیش تر میں نے دیکھا ہو۔'' اُن کے چہرے پر اور خاص طور پر آنکھوں میں کھیلتا والہانہ جوش اور انبساط مجھے اب بھی یاد ہے۔ اس میں کسی بچے جیسی معصومیت اور اشتیاق صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوؔدا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا مَیں

اُن لمحات اور اُن کے چہرے کو یاد کرتے ہوئے مجھے عبیداللہ علیم کی مختصر نظم 'چہرے' یاد آتی ہے۔

چہرے

کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں
پل بھر کو آنکھ میں آتے ہیں
اور برسوں دل میں رہتے ہیں

چھاؤں چھاؤں جیسے چہرے
سچے خوابوں جیسے چہرے
ننھے بچوں جیسے چہرے

چہرے موم کی گڑیوں جیسے
اُرس نہائی پریوں جیسے
شاخ پہ بیٹھی چڑیوں جیسے

اِمسال فروری کے آخری ہفتے اور مارچ کے پہلے ہفتے میں اُن سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی۔ دراصل میں نے انہیں بتایا کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک طویل افسانے 'روشنی کی رفتار' میں قدیم مصر کا ذکر کیا ہے۔ اِس افسانے کا مرکزی کردار ڈاکرید ماکماری ٹائم مشین کے ذریعے قدیم مصر کے اُس دَور میں پہنچ جاتی ہے۔ جب بنی اسرائیل بھی مصر میں موجود تھے۔ یہ افسانہ انہوں نے مجھ سے کتاب لے کر پڑھا۔ پھر میں نے اُنہیں اِس کا عکس بنوا دیا، لیکن اِس افسانے میں اُن کی دل چسپی بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہ افسانہ میں نے کم از کم دو مرتبہ انہیں پڑھ کر سنایا۔ وہ سنتے جاتے اور ہنستے مسکراتے خوب محظوظ ہوتے اور قرۃ العین حیدر کو شاباش دیتے جاتے۔ اسی اثنا میں ہم کینو کھاتے (مرزا صاحب کو کینو بے حد پسند تھے) اور کراچی سے آیا ہوا سوہن حلوہ بھی۔

اُن دنوں اُن کی بیگم اپنے بھائی کی عیادت کے لیے امریکا گئی ہوئی تھیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ میں اِس افسانے کا تجزیہ کروں۔ مرزا صاحب کی خواہش کے مطابق جلد ہی میں اِس افسانے کا تجزیہ قلم بند کروں گا۔

مرزا صاحب انتہائی منکسر المزاج تھے۔ کبر و نخوت تو انہیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ ایک بار میں نے انہیں بتایا کہ ملتان کے قریب ہی چک نمبر ۱۳ میں کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ مجسی ندیم اجمل عدیؔم کے ہمراہ وہ دیکھنے چلیں گے اور کچھ Excavation کریں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بتایا کہ ملتان کے قریب ایک قصبہ ہے متی تل، وہاں بھی ایک ٹیلا ہے۔ روایت ہے کہ وہاں سلطان محمد تغلق اور اُس کی فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ وہاں سے بھی مختلف چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ وہاں چلیں گے اور کھدائی کریں گے۔ وہ فرمانے لگے: ''بھئی! میں تاریخ کا طالب علم ہوں، ماہرِ آثارِ قدیمہ نہیں ہوں۔ اس لیے ایسے آثار کو تو ماہر آثارِ قدیمہ ہی ہاتھ لگائیں تو بہتر ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس چیز کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں جب کہ میں نے یہ تربیت حاصل نہیں کی۔''

ماہ جون میں، مَیں اپنی کتاب ''نتائجِ فکر'' اُن کی خدمت میں پیش کرنے گیا تو وہ خود ہی دروازے پر تشریف لائے۔ مَیں اُن کی جسمانی حالت دیکھ کر پریشان رہ گیا۔ وہ انتہائی کم زور ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے اُن کے چہرے پر صرف آنکھیں ہی نمایاں ہو گئیں تھیں۔ میں نے کتاب اُن کی نذر

کی۔ بہت خوش ہوئے۔ میں نے کہا کہ آپ ابھی آرام کریں میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں اور پھر خوب باتیں ہوں گی۔ یہ کہہ کر میں نے رخصت چاہی مگر مجھے احساس ہو گیا کہ اب میرے دوست کے بچھڑنے کا وقت دُور نہیں۔

اُن کے چہرے پر موت کی سردی مہری نمایاں تھی مگر اُن کی آنکھوں میں زندگی کی تڑپ اور مزید کام کرنے کی حسرت آشکار تھی۔ لگتا ہے وہ مشتاق نگاہیں اب بھی مجھے تک رہی ہیں۔

ہر کسی کے چہرے میں/ اک قیاسی ہوتی ہے/ رُخ کے ایک حصے میں/ حسن کے علاقے
کی/ اک اداسی ہوتی ہے/ اُس کو مَیں نے دیکھا تھا/ گرم خُو مہینوں میں/ اک خوشی کی محفل
میں/ شہر کے مکینوں میں/ اک طرف کھڑے تنہا/ جس طرف کو رستے تھے/ جس کے ساتھ
گلیاں تھیں/ جن میں لوگ بستے تھے/ بے کشش مکانوں میں/ جیسے چاندراتیں تھیں/ اس کے
سرد چہرے میں/ خوش گوار آنکھیں تھیں

موت سے چند روز پہلے میں اور قاضی عبدالرحمان عابد اُن کی عیادت کے لیے گئے۔ اُن کی طبیعت کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ کچھ باتیں بھی ہوئیں۔ مجھ سے کہنے لگے: ”میں 'سطور ۵' کے لیے جو مضمون (قدیم مصری ادب میں تلفظ کا مسئلہ) دیا تھا اُس کی میرے پاس کوئی نقل نہیں ہے۔ مجھے اُس کی نقل بنوا دیں۔“ میں نے اگلے دن ہی اس مضمون کا عکس بنوا کر اُن کے حوالے کر دیا۔

۲۹ر جولائی کی شام ہم اُن کے ہم راہ اُن کے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ اُن کے جنازے میں بزرگوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔ جسے دیکھ کر محبی احمد ندیم تونسوی نے کہا: ”جس شخص کے جنازے میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہو وہ کبھی نہیں مر سکتا۔“

مرزا صاحب کے جسدِ خاکی کو لحد میں اُتارتے ہوئے محبی عامر سہیل نے کہا: ”آج ممیوں پر تحقیق کرنے والا خود ممی بن گیا ہے۔“

ابھی ہمیں مرزا صاحب جیسی ہستی کی ضرورت تھی، ابھی ملتان کو مرزا صاب کی ضرورت تھی، ابھی اُردو زبان و ادب کو مرزا صاحب کی ضرورت تھی۔ ابھی انہیں بہت کام کرنا تھا۔ ابھی انہیں بہت سے انکشافات کرنے تھے۔ ابھی 'قار پرستی' پر تحریر کردہ تقریباً ایک ہزار صفحات کو انہیں ترتیب دینا تھا۔

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

☆☆

ایم۔ خالد فیاض

مرزا ابنِ حنیف۔ علم کا ایک بہتا دریا

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

”کس طرح کی زندگی موت ہے اور کون سی موت زندگی اور زندگی کا تسلسل ہے؟“

یہ سوال فقیر محمد لاشاری نے سید سبط حسن کی موت پر دہرایا تھا اور اس کے دہرائے جانے کی توضیح یہ پیش کی تھی کہ ”یہ سوال ہر ایسے انسان کے بظاہر بچھڑ جانے سے پیدا ہوتا ہے جس نے زندگی کا زیادہ تر عرصہ بامقصد طور پر گزارا ہو (اور) زندگی کا زیاں نہ کیا ہو۔۔۔“

جو لوگ ابنِ حنیف صاحب کی زندگی سے تھوڑا بہت بھی واقف ہیں وہ بھی میری اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ اُن کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو بامقصد طور پر زندگی گزارتے ہیں اور زندگی کا لمحہ لمحہ اپنے مقصد کے حصول میں صرف کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم بھی آج ابن حنیف صاحب کی موت پر یہ سوال دہرائیں تو یقیناً بے جا نہ ہوگا۔

جس روز مجھے روزگار کے سلسلے میں شہر ملتان سے گجرات روانہ ہونا پڑا، اُسی روز سے مجھے دھڑکا تھا کہ اب شاید مرزا صاحب سے میری ملاقات نہ ہو سکے گی اور اب مرزا صاحب کی وفات کی متوقع مگر اچانک خبر نے اس دھڑکے کی تصدیق کر دی۔

ابنِ حنیف صاحب سے میرا پہلا تعارف اُن کی کتاب ”مصر کی قدیم مصوری“ کے ذریعے سے ہوا۔ اس چھوٹی سی اور انتہائی مختصر کتاب نے میرے ذہن و شعور پر چند حوالوں سے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ایک تو مصر کی قدیم تاریخ اور تہذیب سے نہ صرف پہلی بار قدرے تفصیلی اور گہری آگاہی ہوئی بلکہ اس مصری تہذیب کے بارے میں مزید جاننے کا شوق اور ولولہ بھی پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ مصوری کے اسرار و رموز سے بھی پہلی بار اس قدر واقفیت پیدا ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ مصوری کس قدر خوبصورت، معنی خیز اور بڑا آرٹ ہے۔ اس طرح مجھ پر انسانی تہذیب و تاریخ میں آرٹ کی بالعموم اور مصوری کی بالخصوص اہمیت واضح ہوئی۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”آج آرٹ کی دنیا کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ فرائض میں سب سے زیادہ خراب فریضہ اور مقاصد میں سب سے زیادہ شرانگیز مقصد، اسے سونپا گیا ہے۔“ میں اگرچہ اُس وقت اس بات کا تو قائل نہیں تھا کہ آرٹ کو کوئی شرانگیز مقصد یا زیادہ خراب فریضہ

سونپا گیا ہے مگر میں آرٹ کو بہرحال کوئی زیادہ بامعنی فریضہ یا پُرامن مقاصد کا باعث بھی نہیں گردانتا تھا لیکن اس کتاب کے مطالعے نے آرٹ کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ آرٹ کس طرح تہذیبوں کے علم کا ابلاغ کرتا ہے۔ کس طرح تہذیبیں آرٹ میں محفوظ ہو جاتی ہیں اور کس طرح آرٹ کے یہ نمونے آنے والی نسلوں کے لیے ان قدیم تہذیبوں کی بازیافت کا وسیلہ بنتے ہیں۔ لہٰذا اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ مجھے آرٹ کا منکر ہونے سے ابنِ حنیف کی اس کتاب نے بچا لیا اور صرف منکر ہونے سے ہی نہیں بچایا بلکہ آرٹ کا گرویدہ بھی بنا دیا۔

اس کتاب سے بے حد متاثر ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کے اکثر و بیشتر اقتباسات اب بھی میرے ذہن میں جوں کے توں موجود ہیں اور ان میں سے چند اقتباسات میں یہاں پیش کرنے کی اجازت بھی چاہوں گا۔ آرٹ کے تہذیب اور معاشرے سے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے ابنِ حنیف لکھتے ہیں:

> ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی عصر یا عہد کے آرٹ کی بنیادیں اس عہد یا عصر کے تہذیبی اور معاشرتی کوائف، معاشی اور اخلاقی اقدار اور فکری اور نفسیاتی میلانات میں سمائی ہوتی ہیں، لیکن اس کے باوجود آرٹ بطور ایک آزاد تخلیقی قوت کے اظہار و نمو کے ذاتی اُصول بھی رکھتا ہے اور اس کا تعلق بنیادی انسانی اقدار سے زیادہ گہرا ہے۔ یوں ہر عصر کا آرٹ اپنے عہد کی تہذیبی اور معاشرتی وحدت کا ایک حصہ ہوتا ہے، یہ ایک ایسا جزو ہوتا ہے جو اپنی معنوی قدر و قیمت کے اعتبار سے اپنے کُل پر بھاری ہوتا ہے، ہر تہذیبی وحدت آرٹ کے ذریعے ہی اپنے نامیاتی، حرکی اور ارتقائی عوامل کے تاریخی کردار کا مشاہدہ کرتی ہے اور آرٹ ہی تہذیبی عوامل کے پس پردہ کام کرنے والی بنیادی انسانی اقدار کو زندہ اور پائیدار بناتا ہے۔''

مختلف فنکاروں کے درمیان قدرِ مشترک کی تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شاعر، ادیب، مصور، سنگتراش اور موسیقار محض 'ذریعۂ اظہار' کے اعتبار سے ہی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، وگرنہ جہاں تک تخلیقی تجربے اور تخلیق اظہار کی خواہش کا تعلق ہے، وہ ان سب کے لیے قدرِ مشترک کا ذریعہ رکھتی ہے۔''

ایک جگہ مذہبی عقیدے کو عظیم تخلیقات کا باعث قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مذہبی عقیدے اور نظریے بھی تاریخ انسانی کے بڑے بڑے کمالات کے ظہور اور عظیم (فنی) تخلیقات کا باعث ہوئے ہیں۔''

مصر کی مصوری کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے ابنِ حنیف کہتے ہیں:

> ''کبھی کبھی مجھے خیال آیا کرتا ہے کہ اگر مصر کے پرانے لوگ اپنی تصاویر کا اس درجہ عظیم الشان، اہم اور متنوع ذخیرہ نہ چھوڑ جاتے تو یہ جو آج دنیا کو اُن کی شاندار تہذیب و تمدن کے متعلق اتنی ساری معلومات حاصل ہیں، ان تصویروں کی عدم موجودگی میں اس قدر کہاں نصیب ہوتیں، ان کی عوامی زندگی کے حالات جاننے کا یہی تو بہت بڑا ذخیرہ ہیں۔ ایک فقرے میں یوں ساری بات سمیٹی جا سکتی ہے کہ ان کی مصوری ہمارے لیے 'انسائیکلوپیڈیا' کا درجہ رکھتی ہے۔''

آرٹ کے بارے میں ایک اور جگہ مختصر الفاظ میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''آرٹ نہ صرف ایک تخلیقی اظہار ہے بلکہ انسان کے لیے اپنی ذات کو بہتر اور مکمل طریق پر سمجھنے اور اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ اظہار کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔''

یہ اقتباسات تو چند مثالیں ہیں جو اُن کی انتہائی مختصر کتاب میں سے یہاں پیش کی گئیں، اس لیے کہ یہی تحریریں ابنِ حنیف صاحب سے میرے پہلے تعارف کا باعث نہیں۔ ورنہ اُن کے علمی اور تحقیقی کام کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اُس کا احاطہ کرنا تو بہت دُور کی بات، تذکرہ کرنا بھی اس مختصر سی تحریر میں ممکن نہیں۔ مگر اُن کے اس علمی اور تحقیقی کام کو سامنے رکھتے ہوئے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے خالص ادیب تھے جنھوں نے آج کل کے ادیبوں کی طرح لفظوں کے وہ کارخانے نہیں لگائے جہاں منڈی کی ضروریات اور صارفین کی خواہشات کے مطابق الفاظ کا مال تیار کیا جاتا ہو بلکہ انھوں نے خالص علمی ضروریات اور فکری احتیاجات کے مطابق الفاظ کا ایسا گراں قدر سرمایہ اپنے سوگواران کے لیے چھوڑا ہے جو اُن کے علم کی پیاس برسوں بجھاتا رہے گا۔ اُن کے اس علمی کام میں تجارتی یا مالی منفعت کی بُو کہیں نہیں آتی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے الفاظ سچائی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ایسی حقیقی سچائی جو کسی ادیب کے لیے باعث افتخار ہو سکتی ہے۔

ابنِ حنیف صاحب سے میرا دوسرا تعارف اُس وقت ہوا جب ہم ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے اُردو ڈیپارٹمنٹ نے ہمیں ابنِ حنیف صاحب سے خصوصی ملاقات کرانے کا اہتمام کیا۔ یہ ملاقات مرزا صاحب کے گھر پر ہوئی۔ میرے سامنے ''مصر کی قدیم مصوری'' والے ابنِ حنیف موجود تھے۔ اس پہلی ہی ملاقات میں مجھے اُن کی عاجزی، شائستگی، انکسار، دھیما لہجہ اور اُن کے سلجھے ہوئے مہذبانہ اندازِ گفتگو نے، جس میں کسی طرح کی بناوٹ کا عمل دخل نہیں تھا بلکہ انتہائی خلوص اور محبت کی چاشنی موجود تھی، بے حد متاثر کیا اور اُن کے اسی مخصوص لہجہ اور اندازِ گفتگو سے ہی اُن کے اعلیٰ شخصی اوصاف اور وسعت مطالعہ کا اندازہ بھی ہوا۔

اس کے بعد ''اُردو اکیڈمی'' اور اُن کے گھر پر اکثر و بیشتر اُن سے مختصر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری

رہا مگر ان مختصر ملاقاتوں میں بھی علم کے بہت سے گوہر ہاتھ لگ جاتے۔ اگرچہ اکثر اوقات اُن کی طبیعت ایسی ہوتی کہ وہ زیادہ بولنے میں کچھ دقت محسوس کرتے مگر پھر بھی جب کوئی علمی بات چھڑ جاتی، خاص طور پر کوئی تاریخی یا تہذیبی اور وہ بھی مصری یا سومیری تہذیب کے حوالے سے تو وہ حتی الامکان کوشش کرتے کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اور جس قدر وہ بتا سکتے ہیں، اپنے سننے والوں کو بتا دیں۔ قدیم مصری اور سومیری تہذیبوں سے متعلق موٹی موٹی کتابیں اُٹھا لاتے اور اُس میں سے اس عہد کی مصوری اور تحریروں کے نمونے دکھاتے حتیٰ کہ اُن قدیم زبانوں کو کہیں کہیں سے پڑھ کر سنا بھی دیتے۔

انسانی فکر ازل سے زندگی کے مقصد کو تلاشنے کی تگ و دَو میں مصروف رہی ہے اور اس تگ و دَو میں بہت سے جوابات تراشے گئے ہیں (اور اگرچہ راقم الحروف اس بارے میں اب تک تراشے ہوئے کسی جواب سے مطمئن نہیں ہو سکا) مگر ابنِ حنیف صاحب کی زندگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زندگی کا جو مقصد نظر آتا ہے وہ صرف اور صرف علم کا حصول ہے۔ ماں کی گود سے لے کر لحد تک علم حاصل کرنے کا مقولہ اُن کی ذات پر صادق آتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ مرنے سے پہلے ممکنہ حد تک انہوں نے اپنی زندگی کا آخری لمحہ بھی مطالعہ ہی میں صرف کیا ہوگا۔ اس طرح ابنِ حنیف صاحب کی پُر امن اور مہذب و شائستہ زندگی سے ہمیں جو فوری سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قدر علم ہے اور سب سے قیمتی اشیا کتابیں ہیں۔

میں مرزا صاحب کو کچھ زیادہ نہیں جانتا کیونکہ میری اُن سے یاد اللہ کوئی پچھلے پانچ برس سے ہے۔ اس میں سے بھی آخری دو سال نکال دیجیے کہ ان دو سالوں میں اُن سے بالکل ملاقات نہیں ہو سکی۔ یعنی مجھے مرزا صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع محض تین برس سے زیادہ نہیں ملا مگر ان تین برسوں میں، میں نے اُن میں خالص عالموں والی صفات کی جھلک ضرور دیکھ لی۔ عالم کی ایک صفت تو اُس کا علم ہوتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی کچھ صفات اُس کی علمیت کی گواہی دیتی ہیں اور ان میں انکسار، شائستگی، خلوص اور بے لوث محبت جیسی صفات بھی شامل ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میں نے ان سب کے علاوہ جو ایک اور صفت مرزا صاحب میں دیکھی اور جو بہت کم دوسرے عالموں میں کہیں نظر آتی ہے، وہ ہے اُن کی دنیاوی معاملات سے شان بے نیازی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ وہ دنیاوی فریضوں سے لاپرواہ تھے بلکہ دنیاوی معاملات سے یہاں میری مراد ادیبوں اور عالموں کا اپنے علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ ایسے لغو اور بے معنی مشاغل میں اُلجھنا ہے جو اُن کے شایانِ شان نہیں۔ مثلاً جھوٹی شہرت کی تمنا اور اُس کی تگ و دَو، ادیبانہ جیلسی، منصبی سیاست میں جوڑ توڑ، خوشامدی رویہ، نمود و نمائش کا جذبہ، گپ شپ میں وقت کا زیاں اور سب سے بڑھ کر علمی و ادبی بے ایمانیاں وغیرہ۔ اکثر و بیشتر ادیب ایسی ہی سرگرمیوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں مگر ابنِ حنیف ایسی تمام دنیاوی سرگرمیوں سے قطعاً بے نیاز تھے اور یہی اُن کی سب سے بڑی عالمانہ صفت ہے۔

تہذیبی طور پر پس ماندہ معاشروں کا بالعموم اور ہمارے معاشرے کا بالخصوص ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں ادیبوں اور فنکاروں اور خاص طور پر ابنِ حنیف جیسے جینوئن ادیبوں کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ انہیں ناقدری اور تنگی ترشی کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے اور معاشی عدم آسودگی اُن کی فنکارانہ اور عالمانہ صلاحیتوں کو زنگ کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ مرزا صاحب کی زندگی کو بھی اس المیہ سے دوچار ہونا پڑا اور اگرچہ اُن کے لبوں پر کبھی اس بات کا شکوہ نہیں آیا مگر اس کا احساس انہیں خوب اچھی طرح سے تھا۔ ایک جگہ وہ قدیم مصری معاشرے میں فنکاروں کی قدر شناسی اور معاشی آسودگی کا موازنہ آج کل کے فنکاروں کے ساتھ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مصری فنکار اور صناع کچھ ہمارے موجودہ آرٹسٹوں کی طرح تنگی ترشی یا ناقدری کی زندگی بسر نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی زندگی اکثر و بیشتر مصریوں کی نسبت کہیں زیادہ پُر آسائش اور فراغت کی زندگی تھی۔۔۔ عام طور پر انہیں تعجیل پسندی پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ وہ اپنی مرضی، اطمینان اور تسلّی سے کام کرنے میں آزاد تھے۔۔۔ اُن کے تخلیق کردہ کندہ کاری، مصوری اور بت تراشی کے کئی نمونے آرٹ کی دنیا کی بہترین تخلیقات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ مصری آرٹسٹوں کی یہی سہولت اور فارغ البالی بھی تھی۔ اخناتون کے دارالحکومت میں پیکر تراش اور مصور قبرستان کے قریب ایک بستی میں رہتے تھے جس کے گرد چار دیواری بنی ہوئی تھی جو ٹھاٹ باٹ اور شان انہیں میسر تھی وہ تو شہروں میں بسنے والے اکثر فنکاروں کو آج بھی نصیب نہیں۔''

اور اب آخر میں اسی حوالے سے میں آپ کو اپنے دکھ کی اصل وجہ بتانے جا رہا ہوں کیونکہ مجھے دُکھ محض مرزا صاحب کی موت کا نہیں ہے، کہ موت تو ایک ایسی اٹل حقیقت ہے، جس کا سامنا ہر ذی روح کو آج نہیں تو کل کرنا ہے۔ مجھے تو دُکھ ہے زمانے کے ہاتھوں ہونے والی اُن کی اسی ناقدر شناسی کا کہ اس زمانے نے ایک اور نابغۂ روزگار اور غیر معمولی علمی ہستی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں حد درجہ بے حسی کا مظاہرہ کیا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بے حسی کا یہ مظاہرہ مزید شدت اختیار کرتا چلا جائے گا اور میں سمجھتا ہوں زمانے کی ایسی بے حسی بھیانک ظلم کے زمرہ میں آتی ہے اور ابنِ حنیف صاحب پر یہ ظلم ہوتے دیکھنا اور اُس کے خلاف کچھ نہ کر پانے کا احساس ہی اصل میں میرے اس دکھ کا باعث ہے۔

☆☆☆

خالد محمود سنجرانی

مردافگنِ عشق

یہ کیسا ستم ہے جو مجھے اب بھی محسوس ہوتا ہے کہ جب میں ملتان جاؤں گا تو ''بیکن بکس'' کے سامنے یا کہیں آس پاس ابنِ حنیف مجھے نظر آجائیں گے۔ سیاہ رنگ کا چھوٹا سا پرانا بیگ دائیں بغل میں دابے، سفید کُرتا اور شلوار پہنے، سڑک سے کچھ ہٹ کر، سر جھکائے ہوئے، اِردگرد سے بالکل بے خبر اور بے نیاز ہو کر چلتے ہوئے مل جائیں گے۔ میں موٹر سائیکل ان کے قریب جا کر روک دوں گا۔ وہ چونک کر رُک جائیں گے۔ ''ارے بیٹا! تم کب آئے۔'' میں ان کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دوں گا۔ ''ایک تو یہ انوار نے بڑی گڑبڑ کی ہوئی ہے۔ ہر ایک سے کہہ دیتا ہے کہ میں علیل ہوں اور موثر عیادت یہی ہے کہ مجھ سے نہ ملا جائے۔ آرام کرنے دیا جائے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔''

قریب ہی تو ان کا گھر ہے۔ ایک آدھ جملے کے بعد گھر آ جاتا ہے۔ ''تم یہیں ذرا رکو بیٹا، میں کمرہ کھلوا دوں۔'' ان کا ڈرائنگ روم کسی مصری نژاد پاکستانی کا کمرہ دکھائی دیتا ہے، لیکن ہلکا پھلکا، اتنا زیادہ بھرا ہوا بھی نہیں کہ طبیعت پر بوجھ پڑے۔ دیواروں پر مصری تصاویر، کشن کے غلافوں پر مصری اہرام اور نقوش چھوٹی میزوں پر کچھ مورتیاں اور بس۔ ''یہ تصوکس کی ہے۔'' ''یہ فرعون چہارم ہے۔ جو فرعون بدنام ہے نا! یہ وہ نہیں ہے۔ اس کی پشت میں سے ہے۔

وہ پھر تفصیل سے سمجھانے لگتے اُس عہد کی زبان، تہذیب، مذہب سبھی کچھ گفتگو میں آ جاتا۔ اچھا بیٹا، چھوڑو اِن باتوں کو، یہ بتاؤ میرا لاڈلا (اصغر ندیم سیّد) کیسا ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں اسے لاڈلا کیوں کہتا ہوں۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے، مونچھوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مگر ابھی تک نالائق لاڈ کرتا ہے۔ میری ساری کتابیں ''بیکن بکس'' والوں نے چھاپی ہیں۔ سنگِ میل والوں نے مایوس ہو کر میرے لاڈے کو کہا کہ ابنِ حنیف کی کوئی کتاب لے آئیں۔ بس اب لاڈلا جو ہوا۔ کوئی روک سکتا ہے اسے میری ایک کتاب اُٹھا کر لے گیا کہ جی یہ سنگِ میل والوں سے چھپوانی ہے۔ ہے کیسا وہ اب؟ اس کے بچے کیسے ہیں؟۔۔۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان تو اب جی سی یو آ گئے ہیں۔ تو میرا اسلام کہنا۔ جب یہاں رائٹرز گلڈ کے اجلاس ہوئے تھے تو تب وہ شاید بی۔ اے کے طالب علم تھے اور باقاعدگی سے ان جلسوں میں آیا کرتے تھے۔ میں نے ایک زمانے میں کتاب گھر بھی کھولا تھا، ادبی و علمی قسم کا۔ اس کا مجھے بڑا فائدہ ہوا کہ اس کاروبار کی آڑ میں مَیں نے اپنی کچھ پسندیدہ کتابیں منگوالیں۔ گھر والوں کو کیا پتہ چلتا۔ حیران بھی تھے کہ میرا کتاب گھر کچھ زیادہ چلا نہیں۔ سارے ادبی رسائل وغیرہ منگوالیا کرتا تھا۔ یہ سہیل احمد میرے باقاعدہ گاہکوں میں سے ایک تھے جو رسائل وغیرہ لے جاتے تھے اور میری کچھ کاروباری عزت گھر والوں کی نظر

میں بن جایا کرتی تھی۔ لاہور جب کبھی جاتا ہوں تو مل آتا ہوں، بڑے پیار اور خلوص سے ملتا ہے۔

ان کے کتاب گھر کے بارے میں بعض روایات جو سینہ بہ سینہ مجھ تک پہنچی ہیں، از حد دلچسپ ہیں۔ مثال کے طور پر یار لوگ سائل خریدتے ہوئے پچاس فی صد کی رعایت کے نہ صرف طالب ہوتے بلکہ زبردستی آدھی رقم ادا کرتے۔ مرزا صاحب مروّت کے مارے یہ گھاٹا برداشت کرتے رہے۔ بہاول پور کے ایک صاحب اس رعایت کے لینے میں پیش پیش ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران میں ایک صاحب ابنِ حنیف کے شناسا نکل آئے۔ ان سے بڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ بتانے لگے کہ جب میں طالب علم تھا تو اساطیر اور تاریخ کی کتب بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ کسی نے ابنِ حنیف کے کتاب گھر کا پتہ دیا۔ میں وہاں پہنچا تو میری پسندیدہ اور کم یاب کتب مجھے وہاں مل گئیں۔ جب خریدنے کی باری آئی تو ابنِ حنیف نے دوٹوک انداز میں کہا: بھائی، یہ کتب فروخت کرنے کے لیے نہیں رکھیں۔'' وہ کہنے لگے میں جس کتاب پر ہاتھ رکھتا، مرزا صاحب جھٹ سے کہہ دیتے ''نہیں یہ بیچنے کے لیے نہیں ہے۔''

یہ بھی تو کیسا ستم ہے جو مجھے اب بھی محسوس ہوتا ہے کہ جب میں ملتان جاؤں گا تو ابنِ حنیف کے گھر حاضر ہوں گا اور وہ بستر پر بیٹھے لیٹے کہیں گے۔ ''معاف کرنا بیٹا! اُٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا۔۔۔'' ''میں سلام کرنے حاضر ہوا تھا اب چلتا ہوں۔'' ''یہ انوار اور ڈاکٹروں کی سازش ہے بیٹا۔ میں تو ٹھیک ہوں۔ بس صرف بیٹھنا دُشوار ہے۔ اتنا بھی نہیں۔۔۔ چائے پی کر جانا بیٹا۔ یہاں اکیلا پڑا پڑا بور ہو رہا تھا۔ اچھا کیا جو انوار کی باتوں میں نہیں آئے۔ میں اپنی صحت سے زیادہ اس کی فکر مندی پر پریشان ہوں۔'' میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر اختر شمار لاہور سے روزنامہ ''خبریں'' کا ادبی صفحہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ پہلی اشاعت آپ کے ایک طویل انٹرویو سے ہو کہنے لگے۔ ''اس سے کہنا کہ تم مجھے عزیز ہو۔ میں تمہارا بڑا احترام کرتا ہوں۔ اسے جو مجھ سے محبت ہے نا بیٹا، وہ بھی محسوس کرتا ہوں مگر میں انٹرویو کیا دوں گا۔ میں کوئی ادیب یا محقق تو ہوں نہیں۔۔۔'' اب اس پر میں نے جب زیادہ احتجاج کیا تو کہنے لگے۔ ''دیکھو بیٹا! اسے میری بدگمانی نہ سمجھنا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں آثارِ قدیمہ کے فن کی باریکیاں جاننے والے لوگ نہیں ہیں۔ لکھنے والے سمجھتے ہیں کہ قدیم تہذیبوں کے آثار پر قلم اُٹھانا ادب کے زُمرے میں نہیں آتا۔ ہم لوگوں نے ادب کو بڑا محدود کر دیا ہے۔ میں اس دائرے میں نہیں آتا اور نہ ہی آنے کی کبھی خواہش کی ہے۔ پوری فضا کو تو کیا کہوں، پڑھے لکھے طبقے نے بھی قدیم آثار، تہذیبوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔ میں انٹرویو دے بھی دوں تو کس کے لیے۔'' میں نے جھٹ سے کہا کہ ان لوگوں کے لیے جن کی خاطر آپ نے مصر کے قدیم ادب، دنیا کے قدیم ترین ادب اور اساطیر کا کام کیا ہے۔ کہنے لگے! ''یہ میں نے اپنے لیے کام کیا ہے بیٹا! مجھے شوق ہے اس کام کا، لوگوں سے زیادہ عزیز مجھے اپنا یہ شوق ہے اور اسی کے لیے کام کرتا رہوں گا۔'' میں نے جب میڈیا سے دُور رہنے پر ان سے زیادہ بحث کی تو فرمانے لگے۔

’’پاکستانی میڈیا آثارِ قدیمہ اور گذشتہ تہذیبوں کی نزاکتوں سے واقف نہیں۔ میں خود بڑا عرصہ روزنامہ ’’امروز‘‘ سے وابستہ رہا ہوں۔ میڈیا یعنی یہاں کا میڈیا باتوں کو توڑ موڑ کر پیش کرتا ہے۔ میں جو کہتا ہوں یہ لوگ اس سے واقف ہی نہیں۔ لہٰذا، جب چھپتا ہے تو میں خود حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ باتیں میں نے تو نہیں کہی تھیں۔ دوسرا، اس سے میرے کام میں بڑا حرج ہوتا ہے بیٹا۔ میرا یہ مزاج کبھی بن ہی نہیں سکا۔‘‘ میڈیا پر جب بات زیادہ چل نکلی تو فرمانے لگے۔

’’بیٹا! ہے یہ نہایت ہی گھٹیا بات۔ لیکن انسان جو ہوا، نکل جاتی ہے کبھی کبھار منہ سے۔ جو بات اب میڈیا کی آپ کو بتانے لگا ہوں نہایت گھٹیا سی بات ہے جو میری زبان سے نکلی۔ ہوا یہ کہ بہت سالوں کی بات ہے جو بی۔ بی۔ سی اور نیشنل جیوگراف چینل والوں کی مشترکہ ٹیم ایک دن اچانک بغیر اطلاع دیے میرے گھر آ گئی۔ میں اپنے کام میں منہمک تھا۔ دروازہ کھولا۔ انہیں اندر بٹھایا۔ کیمرے، روشنیوں کے آلات دیکھ کر طبیعت بڑی مکدر تو ہوئی آدابِ میزبانی کی وجہ سے بیٹا چپ رہا۔ ان سے آنے کی وجہ پوچھی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ فلاں صاحب برطانیہ سے آئے ہیں۔ انہیں آپ کا انٹرویو کرنا ہے اور سکندرِ اعظم کی پنجاب میں آمد اور واپسی کے راستوں کے حوالے سے آپ کی رہنمائی لینی ہے۔ اس موقعہ پر وہ نہایت گھٹیا بات میں نے کہی کہ مجھے اس قسم کی آمادگی دینے کے لیے کوئی خط نہیں آیا۔ ضروری تھا کہ آپ لوگ پہلے یہ دیکھ لیتے کہ کیا میں یہ کام کرنے کے لیے آمادہ بھی ہوں یا نہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہوں نے جب معذرت کی مجبوریاں سامنے رکھیں اور اس سے زیادہ اہم قدیم خطوں، تہذیبوں پر کام کرنے کے اپنے عزائم ظاہر کیے تو مجھے اندر سے خوشی ہوئی کہ چلو کوئی تو ان موضوعات کو ہاتھ لگا رہا ہے۔ میں نے کہا! میری ایک شرط ہے۔ وہ ذرا گھبرائے ہوئے تھے۔ کہنے لگے سو شرطیں بھی ہوں تو ہم ماننے کو تیار ہیں۔ معاوضہ پیشگی دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ تو بیٹا! میں نے کہا نہیں صرف ایک شرط کہ آپ لوگوں کے ہاں بی۔ بی۔ سی اور جیوگرافک چینل پر پاکستان میں موجود قدیم تہذیبی علاقوں کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو لفظ ’’انڈیا‘‘ استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہڑپہ، موہنجوداڑو، ٹیکسلا، ملتان، ٹلہ جوگیاں وغیرہ یہ سب علاقے ’’انڈیا‘‘ میں نہیں ہیں۔ اب یہ علاقے پاکستان میں ہیں جب بھی ان علاقوں کا ذکر ہو یا کوئی ڈاکومینٹری بنے تو یہ کہا جائے کہ یہ قدیم تہذیبی خطے اب پاکستان میں ہیں۔ اب تک جو دیدہ دانستہ طور پر غلطی آپ لوگوں سے ہوتی آئی ہے، اس پر معذرت کی جائے اور آئندہ احتیاط سے کام لیا جائے۔ بس یہی شرط ہے۔ آپ کو اگر اس کا اختیار نہیں ہے تو پھر اپنے افسران سے پہلے بات کر لیں۔ اگر آپ کا اِدارہ شرط ماننے کو تیار ہے تو میں آپ لوگوں کی خدمت بلا معاوضہ کرنے پر تیار ہوں۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ پالیسی میٹر ہے جو ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ میں نے پھر نہایت گھٹیا بات کی کہ اختیار والوں کو بھیجئے اور آپ تشریف لے جائیں۔ پچاس برس سے اوپر ہو گئے ہیں اس سرزمین کو نئی شناخت ملے۔ اب یہاں قدیم تہذیبی خطوں کا نام جب بھی لیا جائے گا تو کہا جائے گا کہ علاقے اب

پاکستان میں ہیں۔ آپ لوگ ’’انڈیا‘‘ کیوں کہتے ہیں۔ تو بیٹا! تم ہی بتاؤ کہ ایسے میڈیا کا میں کیا کروں۔ یہ لوگ میرے کام کے نہیں۔ ان سے دور رہنا زیادہ اچھا ہے۔‘‘

ابنِ حنیف نے پاکستان میں موجود قدیم تہذیبی منطقوں کا جہاں بھی ذکر کیا لفظ ’’پاکستان‘‘ لکھا۔ میں نے ایک آدھ بار دبے دبے انداز میں کہا کہ آپ جس عہد کی بات کرتے ہیں، اس عہد میں تو ’’پاکستان‘‘ اور ’’بھارت‘‘ کا نام نہیں تھا۔ آپ کا یہ انداز تاریخی مغالطہ پیدا کر سکتا ہے۔ فرمانے لگے: ’’بیٹا، بہت بھولے ہو جو اتنی سی بات نہیں سمجھ پا رہے۔ جب بھی کسی عہد کی تاریخ پر قلم اُٹھایا جاتا ہے تو موجود عہد اور خطوں کے حوالے سے نام لیا جاتا ہے۔ اس طرح ان خطوں کی جغرافیائی واقفیت میں آسانی رہتی ہے۔‘‘ میں نے عرض کیا کہ جغرافیائی واقفیت شاید تاریخ کا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ شناخت اور قدیم نام اس سے سوا قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ فرمانے لگے ’’شناخت اور قدر و منزلت تو بیٹا پاکستان ہی سے ہے۔‘‘ ابنِ حنیف سے بندہ جتنا مرضی اُلجھ جائے، ڈھیٹ بن کر خواہ مخواہ کی بحث ہی کیوں نہ کرتا رہے، وہ مشتعل نہ ہوتے تھے، بات کبھی نہیں کاٹتے تھے، اپنی رائے مسلط نہیں کرتے تھے، آواز کبھی اونچی نہ ہوتی تھی۔ ’’تم کیا جانو بچو‘‘ کا سا انداز کسی بھی طور نہ اپناتے تھے۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے جو ہم نوجوانوں کو ان کی ذات کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ہم ان سے کبھی کبھار یوں اُلجھ پڑتے تھے جیسے انہیں کچھ نہیں آتا۔ وہ ہنستے جاتے تھے، باتیں کیے جاتے تھے، تحقیر نہیں کرتے تھے، برستے بالکل نہ تھے۔ بات پوری توجہ اور انہماک سے سنتے تھے۔

مرزا ابنِ حنیف نے کبھی جذبۂ حب الوطنی پر تقریر نہیں کی۔ سچے پاکستان ہونے کے طور پر گفتگو کے آخر میں ’’پاکستان پائندہ باد‘‘ کا نعرہ نہیں لگایا۔ یہ الفاظ زود استعمال سے اپنے معنی کھو بیٹھے ہیں۔ جب زبان سرکاری ہاتھوں میں کھیلتی ہوئی حکومتی ایوانوں میں اپنے خاص مقاصد کے حصول کے تحت بروئے کار لائی جاتی ہے تو الفاظ کا نتیجہ کچھ ہی نکلتا ہے۔ وہ دل کی نہایت گہرائیوں سے اپنے ملک سے پیار کرنے والوں میں سے تھے۔

یہ بھی کیسا ستم ہے۔ جو مجھے اب بھی محسوس ہوتا ہے: ’’بیٹا! قبل از مسیح کا ایک عصری مخطوطہ ایبرس پیپرس (Ebrus Papyrus) کے نام سے ہے۔ اس مخطوطے میں ابنارمل روّیوں کے بارے میں کچھ معلومات ملتی ہیں۔ مصری تہذیب کی قدیم تاریخ میں جنات یا آسیب زدگی کے روّیے اس شدّت سے نہیں ہیں جس شدّت کے ساتھ یورپ کے ازمنہ وسطیٰ میں سامنے آئے تھے۔ مصری تہذیب میں جراحی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کے ہاں مشاہدہ ہے، فلسفہ اتنا نہیں ہے۔ آپ جو ایڈون سمتھ پیپرس (Edwinsmith Papyrus) کا حوالہ دے رہے ہو۔ بیٹا! اس کے لیے ایک تکلیف کرو۔ ڈاکٹروں کی کیا پروا کرنی، میں اب واقعی اُٹھ نہیں سکتا۔ آپ یہ ساتھ والے کمرے میں جاؤ۔ دروازے کے ساتھ جو الماریاں ہیں، ان میں تیسری الماری کے دوسرے خانے میں سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک جیسی چند

کتابیں پڑی ہیں، پانچویں نمبر والی کتاب، تمہارے دائیں ہاتھ سے پانچویں نمبر والی کتاب، وہ ذرا لے آؤ۔ بیٹھ کر اس میں (Ed) والا صفحہ تلاش کرو۔ اس میں شاید معلومات مل جائیں۔ اچھا رہنے دو اس کتاب کو فلاں الماری، فلاں خانہ، فلاں کتاب۔'' انہوں نے کتب منگوائیں مگر مطلوبہ حوالہ جب نہ ملا تو کچھ فکر مند سے ہوئے۔ ''بیٹا! مجھے اس انٹرنیٹ پر کچھ زیادہ اعتبار ہے نہیں۔ اگر تو وہ مخطوطہ موجود ہے اور جیسا کہ آپ بتا رہے ہو کہ پروفیسر بریسٹڈ (Prof. Breasted) نے اسے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے تو اس کا حوالہ کتب انسائیکلوپیڈیا میں مل جانا چاہیے تھا۔ چلو، بھول چوک انگریزوں سے بھی ہو سکتی ہے۔'' اس کے بعد وہ بڑی دیر تک لیٹے لیٹے میرے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ چہرے پر بشاشت برقرار تھی۔

ابنِ حنیف صاحب کی شخصیت میں مغلی شان کا دریچہ مجھ پر استادِ گرامی ڈاکٹر انوار احمد نے کھولا۔ میری ابنِ حنیف صاحب سے راہ و رسم ایسی تھی اور اتنے محدود عرصے کے لیے کہ مجھے کبھی اس پہلو کا اندازہ نہ ہو سکا۔ میں گذشتہ تقریباً چار سال کے عرصے کو ذہن میں لاتا ہوں تو یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتا ہوں کہ جتنی خدمت انوار صاحب اور بیکن بکس کے جبار صاحب اور فیض صاحب نے ان کی اس مدت میں کی، سگی اولاد بھی کیا کرتی ہوگی۔ ابنِ حنیف صاحب کے بارے میں انوار صاحب ہمیشہ قدرے فکر مند رہے تھے۔ کہنے لگے کہ اگر ابنِ حنیف صاحب بی۔اے پاس کر لیتے ۔۔۔ تو یونیورسٹی میں ان کی ملازمت کا کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور کر لیتا مگر وہ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ایک بار زمانۂ طالب علمی میں بی۔اے میں تاریخ کے پرچے میں کمپارٹمنٹ آ گئی تھی۔ اس کے بعد گھر والوں نے دوستوں نے سبھی نے انہیں سمجھایا کہ یہ کمپارٹمنٹ ہماری میراث ہے، اسے قبول کریں۔ انہوں نے اس قسم کی بی۔اے کرنے سے انکار کیا کہ تادمِ مرگ اس پر قائم رہے۔ منٹو کے اردو میں فیل ہونے کی وجوہات جو بھی ہوں، ابنِ حنیف صاحب کے تاریخ کے پرچے میں فیل ہونے کی وجہ واضح ہے کہ انہوں نے اس پرچے کی تیاری کسی گائیڈ ٹائپ کتاب یا نوٹس سے نہیں کی تھی۔ لوگ بتاتے ہیں کہ انہوں نے تاریخ کی کوئی عمدہ سے عمدہ تین ساڑھے تین سو کتابیں پڑھی تھیں۔ جس روز پرچہ تھا، اس روز امتحان کے تین گھنٹے پہلے ہی سوال کا جواب لکھنے پر صرف ہوئے وہ سوال بھی ادھورا رہ گیا، دوسرے سوال کا جواب شروع کرنے کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ ان کی وفات سے چند سال قبل انوار احمد صاحب نے یونیورسٹی کے نوزائیدہ سرائیکی ریسرچ سنٹر میں ان کے لیے گنجائش نکالی۔ سرکاری ملازمت کے لیے انوار صاحب نے ابنِ حنیف کو جس طرح قائل کیا ہوگا وہ انہی کا خاصا ہے۔ یار! لوگوں نے اس پر بڑی انگلیاں اُٹھائیں کہ ایک غیر سرائیکی آدمی سرائیکی سنٹر کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ انوار احمد یہ کہہ کر سب کو چپ کرا دیتے کہ اس سنٹر کی فلاح اسی میں ہے کہ یہ غیر سرائیکی لوگوں کے ہاتھ میں رہے۔ اپنی وفات سے چند روز قبل اُنہوں نے ملتان سے متعلق نوادرات جو اُنہیں کھدائی کے دوران ملے تھے، سرائیکی ریسرچ سنٹر کو بطور عطیہ عنایت کر

دیے۔ تنخواہ کے مد میں جو کچھ انہوں نے وصول کیا تھا مع سود اس کی ادائیگی کر دی۔

ابنِ حنیف صاحب نے تادمِ مرگ سرکاری یا ذاتی ہر قسم کی امداد لینے سے نہ صرف شدت سے انکار کیا بلکہ اس پر خاصا احتجاج بھی کیا۔ یہی کوئی سال بھر پہلے کی بات ہے جو انوار صاحب نے مجھ سے کہا کہ لاہور کے ایک اشاعتی ادارے کی طرف ابنِ حنیف صاحب کے پانچ ہزار روپے بنتے ہیں، اُن سے جا کر کہو کہ وہ ابنِ حنیف صاحب کو خط میں یہ لکھ بھیجیں کہ ہم نے واجب الادا رقم انوار احمد کو دستی دے دی ہے۔ اس طرح ابنِ حنیف صاحب یہ رقم وصول کر لیں گے اور کوئی صورت نہیں۔ ابنِ حنیف صاحب ان دِنوں سخت علیل تھے اور انہیں علاج معالجے کے لیے رقم کی ضرورت رہتی تھی مگر مجال ہے جو اس ضمن میں کوئی حرف تک منہ سے نکل جائے۔ اس معاملے میں وہ سچے اور کھرے مغل تھے۔ تاہم، ان کے بشرے سے، باتوں سے اور چال ڈھال سے یہ اَنا کبھی نہ چھلکی تھی۔ چہرے پر ہر وقت بچوں کی معصومیت اور لہجے میں نرمی رہتی تھی۔ وہ حلقۂ یاراں میں بریشم تھے، حلقۂ سودوزیاں میں فولاد۔ میں نے لاہور کے ان پبلشرز کے سامنے مدعا بیان کیا تو وہ کہنے لگے کہ انوار صاحب یا آپ کیوں رقم ادا کریں۔ میں خود بھجوائے دیتا ہوں۔ کوئی ایسا خط لکھنا میری شان کے خلاف ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ روز کی ٹال مٹول، بہانوں، معذرتوں کے چھ ماہ گزرنے کے بعد میں نے منی آڈر رسید کی شکل دیکھی، لیکن ان پانچ ہزاروں سے کیا ہوتا تھا۔ میں نے ایک دن انوار صاحب سے بھی کہا کہ ان چند ہزار روپوں سے کیا بنے گا۔ جب میں نے بہت زیادہ زور دیا تو وہ فرمانے لگے ''آپ نہیں جانتے ابنِ حنیف کو، ان کی تیموری اَنا یہ ہے کہ اکادمی ادبیات سے ملنے والا چیک لوٹا دیا کہ میں کسی قسم کی امداد نہ لوں گا۔ اس کے بعد میری سختی آئی وہ ایک الگ داستان ہے۔ کہنے لگے کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے ابنِ حنیف صاحب کی بیگم سے ساز باز کرنے کی کوشش کی کہ اکادمی ادبیات اور دیگر اداروں کے چیک آپ کے نام سے آپ کے اکاؤنٹ جمع ہوں گے۔ ابنِ حنیف صاحب کا نام تک نہیں آئے گا۔ اس رقم سے علاج معالجہ تو ہوتا رہتا ہے، لیکن ان کی بیگم نے کہا کہ میں مرزا صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی چیک وصول نہ کروں گی۔ انوار صاحب کہنے لگے کہ اچھا تو انہیں یہ بھی ہرگز نہ بتائیے گا کہ ہم نے یہ راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ابنِ حنیف صاحب نے اس قسم کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ اپنی وفات سے قبل ابنِ حنیف اپنے زیرِ تکمیل مسودات بالخصوص ''مار پرستی'' کو مکمل کرنا چاہتے تھے۔ مرزا صاحب صرف کتابوں کی مدد سے کام کرنے والوں میں سے نہ تھے وہ عملاً محقق تھے۔ ''مار پرستی'' پر کام کرتے ہوئے وہ ان سندھی دور اُفتادہ علاقوں میں نہ صرف گئے بلکہ وہاں اُن لوگوں کے ساتھ ہفتوں رہے جہاں ''مار پرستی'' زندگیوں کا لازمی جزو تھی۔ وہ اپنے مشاہدات درج کرتے چلے جاتے۔ چند ایک واقعات سننے کا مجھے فخر حاصل ہے۔ جن میں بعض واقعات حیران کُن ہیں۔ ایک ملاقات میں بتانے لگے کہ سندھ کے بعض دور دراز علاقوں میں سانپ فقط جنس کی فکری اور تہذیبی علامت ہی نہیں بلکہ وہاں کی عورتوں کی عملی زندگی کا بھی حصہ ہے۔ قدیم ترین تہذیبوں

سے لے کر موجودہ عہد کے ممکنہ حوالے ان کی گرفت میں تھے۔ میں نے کہا ''اب دیر کس بات کی ہے'' مگر وہ کہاں کام سے مطمئن ہونے والوں میں سے تھے۔ کہنے لگے ''ابھی یہ رہتا ہے، ابھی وہ بھی کام نگاہ سے نہیں گزرا'' میں نے یہ مواد اکٹھا کرنے کی حامی بھری تو بڑے خوش ہوئے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے فنون میں ان کے کچھ مقالات اس موضوع پر شائع ہوئے تھے، جن کی کاپی ان کے پاس نہ تھی۔ میں نے وہ بھجوا دیے۔ اگلی ملاقات پر کہنے لگے کہ شروع سے میری عادت رہی ہے کہ میں تین چار منصوبوں پر اکٹھا کام شروع کر دیتا ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے کہ رکاوٹیں بہت آتی ہیں۔ وسائل (مالی وسائل نہیں) دستیاب نہیں۔ لہٰذا، جب رکاوٹ پڑتی ہے، اس منصوبے کو چھوڑ کر دوسرا لے بیٹھتا ہوں، پھر تیسرا۔ بس ایسے ہی کچھ کام ہو گیا ہے۔ ''مار پرستی'' کے موضوع پر کام اٹکا رہا۔ خواہش کے باوجود سمیٹ نہ سکے۔ ان کے انتقال سے چار پانچ دن پہلے ان کے لاڈلے نے روزنامہ ''جنگ'' میں ان کی علالت اور حکومت کی عدم توجہی پر ایک خوب صورت کالم لکھا۔ اس کالم کو پڑھنے کے بعد عطاء الحق قاسمی نے جدہ کے کسی فنڈ سے پچیس لاکھ روپے دلوانے کی حامی بھری کہ جگر کی تبدیلی کا یہ علاج بھارت میں ممکن تھا۔ ان کے لاڈلے نے انوار احمد صاحب اور میرے ذمے یہ کام سپرد کیا کہ ملتان سے ان کے ڈاکٹروں کی رپورٹیں منگوائی جائیں، پاسپورٹ وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ رقم کا انتظام ہو گیا ہے۔ اب وہ اپنے لاڈلے کو بھلا کیسے روکتے۔ تین چار دنوں میں وہ وہاں چلے گئے کہ جہاں سے ان کا لاڈلا انہیں لا نہیں سکتا تھا، لاڈ کر کے منا نہیں سکتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد سوچتا ہوں کہ کوئی ایسا مردافگنِ عشق ہے جو اس مئے کا حریف ثابت ہو؟

☆☆☆

ناصر حسین بخاری

ہمیں جانتے ہیں کہ وہ شخص۔۔۔

لاہور ٹیلی ویژن سنٹر کے صحن میں لگے ایک سائبان کے نیچے ایک جم غفیر اور ہر شخص سر جھکائے کاغذ کے پُرزوں پر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اُتار دینا چاہتا تھا۔ ہر ایک کے اندر یہ خواہش مچل رہی تھی کہ آخر اس کا نام بھی ذرائع ابلاغ کے بڑے ناموں میں شامل ہوگا۔ کوئی یہ سوچ رہا تھا کہ آخر ایک دن وہ کئی نئے چہرے ٹی وی سکرین پر متعارف کروائے گا۔ اس جم غفیر میں گم مَیں بھی ٹی وی اسٹیشن کی بلند و بالا عمارت کو دیکھ کر نہ جانے کن سہانے خوابوں کے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا کہ اچانک ایک نسوانی آواز نے میرے خوابوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

''السلام علیکم! آپ ناصر بخاری ہیں نا!'' ایک سانولی سنجیدہ سی لڑکی نے پوچھا۔

''جی میں ناصر بخاری ہی ہوں! لیکن میں آپ کو نہیں جانتا۔''

''میں آپ کو بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں۔'' اُس لڑکی کے اس جملے نے میرے تجسس میں اور اضافہ کر دیا اور میرے اندر ایک اعتماد کی لہر آئی اور ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ اس جیسا سنجیدہ لہجہ کہیں پہلے بھی میری سماعت سے ٹکرایا ہے۔ میں نے اُس سانولی بھولی بھالی سی لڑکی سے پوچھا۔

''کیا میں اتنا مشہور آدمی ہوں؟''

''آپ نے ملتان پوسٹ گریجویٹ کالج میں میرے والد مرزا ابنِ حنیف کا کردار ادا کیا تھا اس لیے آپ کی شکل میں کیسے بھول سکتی ہوں؟'' (جواب سن کر خیال آیا مشہور آدمی کی نقل اُتارنے والے مشہور ہو ہی جاتے ہیں۔)

جواب سنتے ہی میں نے سوچا ادبی تاریخ میں میرا نام محفوظ ہو گیا ہے کیونکہ قدرت نے مجھے ایک ایسے شخص سے متعارف کروایا جو بیسویں صدی کے چند بڑے لوگوں میں سے ایک تھا۔ مرزا ابنِ حنیف سے میری ملاقات غالباً ۱۹۹۴ء میں ملتان پوسٹ گریجویٹ کالج ملتان میں ہوئی جب مجھے انگریزی ادب و زبان میں ایم اے کرنے کا عارضہ لاحق ہوا اور اپنے دوست مجاہد عباس کے کہنے پر کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج کے ایک کمرے کے باہر بورڈ لگا ہوا دیکھا، لائبریری! جو لائبریری تو نہ تھی لائبریری نما کہہ سکتے ہیں؟ لائبریری کا بورڈ دیکھ کر اندر داخل ہوا تو ایک دراز قد متین و فطین شخص سیاہ شیروانی میں ملبوس میز پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا؟ ''السلام علیکم!'' میں نے اندر داخل ہونے کے بعد اُس کی توجہ حاصل کرنا چاہی تاکہ لائبریری نما سے کچھ حاصل کیا جا سکے! اُس نے انتہائی متانت سے وعلیکم السلام کہا اور اُس کے بعد بہت ہی مدہم آواز میں بولنا شروع کیا جس کا صرف ایک جملہ میں نے سُنا ''آپ کو کیا چاہیے؟'' اس کے بعد اُس

کے الفاظ اس کے لبوں پر آنے سے پہلے ہی کہیں محفوظ ہوتے محسوس ہوئے! میرے جیسا گنوار اور سامنے اتنا نفیس مزاج شخص! میں نے پوچھا "آپ کے پاس شیکسپیئر پر تنقید کی کوئی کتاب مل سکتی ہے؟" "کیوں نہیں؟ آپ کو کتاب کی فوٹوسٹیٹ مل جائے گی۔" اور پھر وہی ہوا کہ باقی جملہ ہونٹوں تک آتا محسوس ہوا لیکن میں کچھ سُن نہ سکا۔ فوٹوسٹیٹ کا سُن کر شیکسپیئر پر تنقیدی کتاب کا منصوبہ تو ادھورا رہ گیا لیکن میں نے سوچا کہ کالج کے فنکشن میں اس شخص کا کردار اگر کسی مزاحیہ خاکہ کے طور پر کیا جائے تو محفل لُوٹی جا سکتی ہے۔ اگلے ہفتے کالج میں ہونے والے فنکشن میں دوستوں کے سامنے آئیڈیا رکھا تو فیصلہ ہوا کہ ہاں یہ ضرور ہوگا! لیکن مرزا ابنِ حنیف اور کالج انتظامیہ سے معاملہ خفیہ رکھا جائے کیونکہ اندیشہ تھا کہ اتنے بڑے دانشور کی نقل اُتارنے کی اجازت نہیں ملے گی جب کہ وہ خود بھی وہاں موجود ہو۔

کالج فنکشن کا دن آ پہنچا اور پھر میں سیاہ شیروانی پہنے مرزا ابنِ حنیف کے اندازِ بیان کو نقل کرنے کے لیے سٹیج پر آ گیا۔ یہ کوئی دو یا تین منٹ کا خاکہ تھا۔ دورانِ خاکہ مجھے حوصلہ نہ ہوا کہ میں سامنے کرسی پر براجمان اس شخص کی طرف دیکھ سکتا۔ خاکے کے اختتام پر بجنے والی تالیاں اس حقیقت کی غماز تھیں کہ لوگ مرزا ابنِ حنیف سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ فنکشن کے اختتام پر بیسٹ پرفارمر کا ایوارڈ لینے کے لیے میں سٹیج پر آیا تو مرزا ابنِ حنیف کو سامنے مسکراتے پایا۔ مرزا ابنِ حنیف نے اگلے دن مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے مجھے کندھے پر تھپتھپاتے ہوئے کہا! "بخاری صاحب آپ تو بڑے ٹیلنٹڈ فنکار ہیں! خوش رہو۔

لیکن حقیقتاً اب بھی میں مرزا ابنِ حنیف کے اصل کردار سے ناواقف تھا اور پھر جب مجھے اپنے مُرشد یار عامر سہیل اور عصرِ حاضر کے منفرد افسانہ نگار احمد ندیم تونسوی کی ادبی محافل میں بیٹھنے اور کسبِ فیض کا موقع ملا تو ابنِ حنیف کی شخصیت کے کئی پرت کھلتے چلے گئے ملتان کے قیام کے دوران جب مُرشد اور میں ادبی "نس بھج" میں کچھ کر گزرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے تو ایک دن مُرشد نے منصوبہ پیش کیا کہ ول ڈیورنٹ کی سٹوری آف سویلائزیشن کا ترجمہ کیا جائے۔ اچھا بہانہ تھا دونوں ول ڈیورنٹ کی ایک جلد تھامے مرزا ابنِ حنیف کے درِ دولت پر جا پہنچے۔ اُنھوں نے بڑی محبت سے اندر آنے کا کہا اور پھر مُرشد نے اپنا منصوبہ ان کے سامنے پیش کیا۔ مرزا ابنِ حنیف کے چہرے پر خوشی کی لہر ایسے آئی جیسے کسی نے اُن کی سب سے بڑی خواہش کو پورا کرنے کی حامی بھر لی ہو۔ کافی دیر تک تہذیب و تمدن پر گفتگو ہوتی رہی اور ان کے مخلصانہ مشورے لے کر ہم وہاں سے نکلے۔ ان کے ہاں بیٹھے ہوئے میں سوچتا ہی رہا کہ یہ شخص کتنا علم دوست اور علم پرور ہے حالاں کہ ہمارے ہاں ادبی رشک کی بجائے "ادبی شک" کی فضا نے ادب کا "مقدر" ہی "مکدر" کر دیا ہے۔

مجھے اب بھی اس پر رشک آتا ہے کیونکہ یہ مرزا ابنِ حنیف ہی ہے آج جس نے میرے الفاظ کو اعتبار بخشا ہے۔

لیاقت علی

مرزا صاحب - ایک شخصیت ایک عہد

۲۹/جولائی ۲۰۰۴ء کی صبح جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ مرزا ابنِ حنیف ہم میں نہیں رہے تو ایک لمحے کو یوں لگا جیسے ایک نہیں بیک وقت میں نجانے کتنے رشتوں سے محروم ہو گیا۔ میرا باپ، میرا اُستاد، میرا راہنما، میرا بزرگ، میرا دوست، میرا محبوب اور شاید میرا شہر مر گیا۔

میں نجانے خبر دینا چاہتا تھا کہ اس کی تردید کا خواہاں تھا، جب کانپتے ہاتھوں سے میں نے اُستادِ محترم ڈاکٹر انوار احمد کو فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب اُسی صبح راولپنڈی پہنچے تھے۔ اُن کی دُکھ سے بھرائی آواز نے خبر کی تصدیق کی لیکن میرا دل اب بھی ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ کیا خبر یہ افواہ سفر کرتی ملتان سے پنڈی تک جا پہنچی ہو؟ میں نے موہوم سی اِک آس سے خود کو باندھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ افواہ پورے شہر میں پھیل گئی اور اس کی صداقت پر یقین کرنا پڑا۔ بعض سچائیاں کتنی کربناک اور اَن چاہی ہوتی ہیں یہ اُسی روز احساس ہوا۔ مجھے ۱۲/مارچ ۲۰۰۴ء کی اردو اکادمی کی وہ نشست یاد آ گئی جب پروفیسر خادم علی ہاشمی اپنی یادداشتوں پر مبنی مضمون پڑھ رہے تھے اور میں کنکھیوں سے کرسیِ صدارت پر ایک وقار اور متانت سے بیٹھے مرزا ابنِ حنیف کو دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا کہ اب اُن کی طبیعت سنبھلنے لگی ہے۔ اُس لمحے مجھے کہاں خبر تھی کہ یہ در و دیوار اب اُن کی رفاقت کو ہمیشہ ترستے رہیں گے۔ میں تو اُس وقت بھی اُن سے فرقت کے وسوسے دل میں نہ پال سکا جب وفات سے ایک ماہ قبل میں اُن کی عیادت کے لیے اُن کی رہائش گاہ پہنچا۔ اُس روز وہ انتہائی کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ اس حد تک کہ اُنہیں غسل خانے تک جانے کے لیے بھی سہارے کی ضرورت تھی، لیکن اُن کا دماغ جاگتا تھا اور وہ اُسی حوصلے اور وقار سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اُن کے بعض رشتے دار اور عقیدت مند اُس وقت موجود تھے۔ میں پاس رکھی ایک کرسی کو اُن کے پلنگ کے قریب کھینچ کر بیٹھ گیا۔ بیٹا کیسے ہو؟ اکادمی کے اجلاس ہو رہے ہیں؟ یہ وہ آخری سوال تھا جو انہوں نے مجھ سے کیا۔ میرا دل بھر آیا اور میں نے اُن کا ہاتھ اپنی ہتھیلیوں میں لیتے ہوئے کہا: مرزا صاحب یہ آپ کے لگائے ہوئے شجر ہیں انشاءاللہ چھاؤں تقسیم کرتے رہیں گے آپ فکرمند نہ ہوں۔ بس مجھے آپ سے ایک شکایت ہے آپ مسلسل غیر حاضر ہیں اور میں غیر حاضری لگا رہا ہوں۔ آپ آئیں گے تو ہم جرمانہ وصول کریں گے وہ مسکرا دیے اور اپنی علالت کو اس جز وقتی تعطل کا سبب بتا کر کہا: انشاءاللہ میں جلد آؤں گا۔ میں اُن سے وعدہ لے کر آ گیا۔ بیرونی دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے اُن کے بہت سے چاہنے والوں کی طرح رومال سے آنکھوں کے تر کونے صاف نہیں کیے کیونکہ میں تو اُس لمحے بھی

اس بدگمانی کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے غیر حاضر ہونے والے ہیں۔ پھر وہ شام آئی جب میں گول باغ میں واقع ایک مدرسے کے دروازے پہ کھڑا سامنے گول چکر کھاتی اُس سڑک کو دیکھ رہا تھا جہاں میں نے بارہا مرزا صاحب کو اپنا چھوٹا ہینڈ بیگ پکڑے، ویسٹ کوٹ اور شلوار قمیض میں ملبوس، سرمئی رنگ کے سلجھے ہوئے بالوں کے نیچے آنکھوں پر دھرے سفید شیشوں کے چشمے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتے آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ مناظر بہت دور کے نہیں تھے کہ یادداشت میں زندہ کرنے کو وقت درکار ہو۔ یہ تو بہت قریب کی یادیں تھیں اتنی قریب کی کہ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا سامنے وہ پھر اُسی طرح چلے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں آنکھیں میچ کر دوبارہ انہیں آتے دیکھتا مدرسے کے لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا یہ اعلان میری سماعتوں سے ٹکرایا ”نامور صحافی، مشہور دانشور اور تاریخ دان مرزا ابنِ حنیف کا جنازہ تیار ہے تمام اہلِ علاقہ سے گذارش ہے کہ وہ جلد از جلد مسجد میں پہنچیں۔“ وہی گول باغ تھا وہی مدرسے کا بڑا پھاٹک، اُسی طرح اس پھاٹک سے ملحقہ ہوٹل کے تنور میں دھڑا دھڑا پکتی گرم گرم روٹیاں، وہی سامنے سجی کرسیوں پر بیٹھے بھوکے گاہکوں کی بے قراری میں میز پر بجتے خالی گلاس، وہی دو چائے، چار چائے چینی برابر، پتی تیز کی ہدایات اور دوڑتے بھاگتے ویٹر۔ وہی کتابوں کی دکانوں پر بچوں کی ہٹ دھرمی کے سامنے ہتھیار پھینکتے ماں باپ، اُسی طرح سامنے بڑے پبلک کال آفس کے مختلف بوتھوں میں ریسیور کانوں سے لگائے زیرِ لب مسکراتے نوجوانوں کے چہرے، وہی ٹریفک کا شور مچاتا، ہارن بجاتا اژدھام، اُسی طرح اَن دیکھے چہروں کے سیلاب میں گزرنے والا کوئی شناسا چہرہ، وہی چائے کی چسکیوں میں ملکی و بین الاقوامی مسائل پر مغز ماری، سبھی کچھ اُسی طرح تھا جیسا کہ ہر شام اس جگہ دیکھا جا سکتا ہے بس آج اتنا فرق پڑا تھا گزرنے والے شناسا چہروں میں مرزا صاحب کا نہ ہونا یقینی تھا کیونکہ وہ تو ابھی کچھ ہی دیر پہلے سفید اُجلے لباس میں ملبوس لمبی، ابدی اور پر سکون نیند سوئے منتظر تھے کہ زندگی کے اس ڈرامے کی آخری رسم بھی ادا ہو تو وہ رخصت چاہیں۔ دوست احباب اور عقیدت مندوں کا ایک ہجوم تھا جو ایک دوسرے کو پُرسا دیتا موجود تھا۔ کچھ دیر کو یوں لگا جیسے ہم سب اداکار ہیں اور یہ گول باغ محض علاقہ نہیں کوئی بڑا اسٹیج ہے جس پر ہم ایک ہی طرح کے کردار ادا کرتے، ایک جیسے مکالمے ادا کرتے تھک چکے تھے۔ سو آج اس بڑے ہدایت کار نے یکسانیت کو توڑنے کی خاطر اسی ڈرامے میں یہ نیا منظر بھرا ہے۔ کیسا اذیت ناک منظر ہے یہ جس میں مختلف کندھوں پر منتقل ہوتی مرزا صاحب کی میت اب نماز کی ادائیگی کے بعد قبرستان کی طرف جا رہی ہے۔ اے اس معمول کے ڈرامے کے بڑے اور سچے ہدایت کار تیری ہر کہانی برحق، تیرا ہر کردار، تیری ہر عظمت کا منہ بولتا ثبوت مگر کیا ڈرامے کا یہ موڑ ضروری تھا؟

مجھے قبرستان تک ساتھ جانا چاہیے؟ ایک سوال میں نے خود سے کیا۔ نہیں میں زمین کے اس افتخار کو خاموشی سے سفید چادر اوڑھے تو شاید دیکھ سکتا تھا ہمیشہ کے لیے زمین کے سپرد ہوتے نہ دیکھ پاؤں گا۔ یہ میری بددیانتی تھی یا سبک رفتار زمانے میں وقت کی قلت جو بھی تھا میں اُن کے ساتھ قبرستان تک نہ

جا پایا اور واپس گھر لوٹ آیا۔ مجھے نہیں یاد کہ کس نے کہاں لکھا تھا مگر میں نے کسی کا جملہ پڑھا تھا کہ ”بڑا آدمی وہ نہیں جس کے سامنے آپ کو اپنی پست قامتی کا احساس ہونے لگے بلکہ بڑا آدمی تو وہ ہے جس کے سامنے آپ کو اپنے چھوٹے پن کا احساس نہ ہو۔“ بڑے آدمی کے اس معیار پر اگر میں نے زندگی میں عملی طور پر کسی کو پورا اُترتے دیکھا تو وہ مرزا صاحب تھے کہ جنہوں نے کبھی اپنے علم کو تکبر نہیں بننے دیا۔ جو جانتے تھے کبھی کسی منبر سے سامعین تک نہیں پہنچایا بلکہ انہیں میں کھڑے ہو کر بتایا اور جو نہیں جانتے تھے وہ خواہ مجھ ایسے کم علم سے بھی معلوم ہوا تو ایسی معصومانہ حیرت سے جاننے کی خواہش ظاہر کی کہ یک لخت ہمیں اپنا قد بڑھتا ہوا محسوس ہوا اور سینہ فخر سے تن گیا کہ اچھا یہ بات ہم نے مرزا صاحب کو بتائی ہے۔ ایسا بڑا پن ہر دانشور کی قسمت میں کہاں ہے؟ ملتان ہی کیا پاکستان بھر میں کتنے اور بزرگ ہیں کہ جنہیں زیست کا ایسا سلیقہ عطا ہوا جو مرزا صاحب کا وصف تھا۔ یہاں تو وہ بزرگ شاعر اور ادیب بھی ہوتے ہیں جو اشعار ہی نہیں گفتگو بھی باوزن کرنے کے عادی ہیں پر جمال ہے جو کبھی اچھا شعر کہا ہو۔ ہاں مگر انعام کی خواہش میں لکھے جانے والا نادر علمی ذخیرہ اُن کی وہ میراث ہے کہ جس کے کھو جانے کی خوش فہمی بھی اُنہیں رہتی ہے اور تو اور یہ قوم و مذہب سے محبت رکھنے والے دانشور کم و بیش ہر اُس محفل میں مسندِ صدارت پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں جس میں اہلِ اقتدار کی شرکت لازم ہو۔ پھر رواداری محبت اور حب الوطنی کے صدارتی خطبے کے بعد یہ بزرگ دانشور منتظمین سے ان خطبات کا معاوضہ طلب کرنے میں بھی کبھی عار محسوس نہیں کرتے۔ ایسے قد آور ادبا اور اُن کے ادبی کارناموں کی تفصیل کو الگ سے کتاب چاہیے مگر ایسے ہی ہجوم میں جب نظر مرزا صاحب پر آن کر ٹھہرتی ہے تو رشک آتا ہے اور اس خطے اور عہد سے منسوب ہونے میں فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔ اکادمی ادبیات انہیں مالی معاونت کا چیک ارسال کرتی ہے تو دوستوں کے اصرار کے باوجود واپس کر دیتے ہیں۔ امروز سے میڈیکل کی مد میں برسوں پہلے پچاس ہزار سے بھی زائد رقم کا چیک ملتا ہے تو واپس بھجوا دیتے ہیں۔ ملک سے یا بیرون ملک سے کسی دوست احباب سے کوئی کتاب تو دور کی بات رسالہ بھی منگواتے ہیں تو قیمت ادا کرتے ہیں۔ کاش ایسی اعلیٰ ظرفی، عزت کا ایسا پاس اور وضع داری کا ایسا طریق میرے عہد کے سفید بالوں، دبیز شیشوں کی عینکوں اور اکڑی ہوئی گردنوں والے قد آور ادیبوں کو بھی نصیب ہو جائے کہ جن کے چھوٹے چھوٹے ظرف اور اغراض دیکھ کر بسا اوقات اپنے آپ سے بھی نگاہیں چرانا پڑتی ہیں۔ یہ بت ٹوٹنے کا عمل بھی عجیب ہے جہاں یہ بہت سے آنے والے مسائل سے نجات دلواتا ہے وہیں اس کی اذیت ناکی بھی تو اپنی جگہ مسلمہ حقیقت ہے۔ مرزا صاحب کی وضع داری اور اعلیٰ ظرفی کے قصّے گنتے جائیں تو شاید ختم نہ ہوں۔ اپنے ذاتی کتب خانے اور نوادرات کا نایاب ذخیرہ انہوں نے بنا کسی معاوضے کے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کو دے دیا ورنہ کون نہیں جانتا کہ ان نوادرات کو اگر عالمی منڈی میں لایا جائے تو شاید ان کے عوض لاکھوں ڈالرز وصول ہو جائیں۔ پھر اُن کی شائع ہونے والی کتب کے ایڈیشن ملک کے کس نامور پبلشر نے شائع نہیں کرنا چاہے اور اس کے عوض

انہیں کتنی خطیر رقم حاصل نہ ہو سکتی تھی؟ لیکن یہ بھی اُن کی وضع داری اور اس خطے سے محبت تھی کہ ایک مقامی اشاعتی ادارے ہی سے یہ کتابیں چھپوائیں اور اس ضمن میں کبھی کسی حساب کتاب کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اپنے خطے سے محبت اور اس شہر کی تاریخی قدامت کو دریافت کرنے کی خواہش میں اُنہوں نے کیسی کیسی معاشی قربانیاں نہیں دیں۔ قلعہ پر موجود پرانے کرکٹ اسٹیڈیم کی تعمیر کے دوران ستونوں کی تعمیر کے لیے سینکڑوں فٹ کھدائی اور بور سے نکلنے والے کیچڑ میں کھڑے ہو کر اور ٹٹول ٹٹول کر کیسے کیسے نوادرات تلاش نہیں کیے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں رکھ کر پاکستان کی تہذیبی قدامت کو منوانے میں اُن کے کردار سے کیا انکار کیا جا سکتا ہے؟ بعض اوقات تو یہ یقین مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک تنہا فرد اتنا کام کیسے سرانجام دے سکتا ہے جب کہ اسی کام کے لیے لاکھوں کروڑوں کے اخراجات سے چلنے والے ادارے بھی اتنا کام نہیں کر سکے جو انہوں نے بنا کسی حکومتی معاونت یا صلے کی خواہش کے کر دکھایا۔ وگرنہ یہ صلے کی خواہش تو بڑوں بڑوں کو مختصر انتظار کی صعوبت بھی نہیں کاٹنے دیتی مگر مرزا صاحب کو کون نہیں جانتا کہ انہیں دانشور، تاریخ دان، ماہر آثار قدیمہ یا ادیب جیسے صفاتی الفاظ سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ انہیں تو بس اپنے کام سے سروکار تھا کسی کو پسند آ گیا تو انہیں اطمینان ہوا نہیں آیا تو اسے پڑھنے والے کی کم علمی کبھی خیال نہ کیا۔ نوجوانوں سے اُن کا تعلق ہمیشہ نصیحت کرنے والے بزرگوں کے بجائے حوصلہ اور مشورہ دینے والے دوستوں کا سا رہا۔ کسی نے کہہ دیا کہ مرزا صاحب فلاں موضوع پر کام کر رہا ہوں تو پھر بتانے والا بھول گیا۔ مرزا صاحب کو یاد ہے وہ مسلسل تحریک بخش رہے ہیں۔ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں گلہ گوئی اور عیب جوئی کا چسکا ہے۔ بڑی بڑی شخصیات اور معتبر نام بھی اُن کی اس عادت بد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پر کیا یہ عجب نہیں کہ مجھے کبھی کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس کی زبان سے میں نے اُن کا گِلہ سُنا ہو، گِلہ تو دور کی بات کسی نے بنا احترام کے اُن کا ذکر بھی کیا ہو۔ ایسے لوگ یقیناً ایک عہد کا حوالہ بنتے ہیں سو ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم مرزا ابنِ حنیف کے عہد میں رہ رہے ہیں۔ ہمیں ان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا ہے۔ ہمیں اُن کی شفقتیں ملی ہیں۔ محبتیں ملی ہیں اور دعائیں ملی ہیں۔

☆☆☆

رپورٹ: عطاالرحمٰن تمثیل

تعزیتی اجلاس ملتان آرٹس فورم ملتان

ممتاز ماہر آثار قدیمہ، محقق اور دانشور مرزا ابنِ حنیف مرحوم کے لیے یکم اگست ۲۰۰۴ء کو ڈاکٹر فاروق عثمان کی صدارت میں تعزیتی ریفرنس ہوا۔ خالد محمود ملک نے مرزا صاحب کی شخصیت کے حوالے سے ایک مختصر مضمون پیش کیا۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر فاروق عثمان نے کہا کہ مرزا صاحب واقعی ایک چمکتا دمکتا ستارہ تھے ان چند شخصیات میں سے تھے جن کی وجہ سے ملتان شہر کو عزت و افتخار نصیب ہوا۔ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ محبت اور عزت و احترام اور دوستوں کے ساتھ دل داری کرنا ان کا شیوہ تھا۔ میری مرزا صاحب سے شناسائی اسی دور میں ہوئی جب حسین آگاہی میں ان کی کتابوں کی دکان تھی، یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ یہ تعلق چالیس برس تک قائم رہا لیکن میں اس محرومی کا اظہار ضرور کروں گا کہ میری ان سے دوستی نہیں تھی لیکن پھر بھی ان دو لوگوں کے بارے میں گفتگو کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں ایک جابر علی سید ہیں اور دوسرے مرزا ابنِ حنیف ہیں۔ مرزا صاحب کے کسی کے دل کو کبھی رنج نہ پہنچایا ان کا ثانی اگر کوئی ہے تو میری نظر میں وہ صرف اور صرف فیض احمد فیض ہیں۔ ان کے اور میرے درمیان جو نقطۂ اتصال بنتا تھا وہ یہ تھا کہ تصور پاکستان کو ہم تاریخ کی صحیح سمت مانتے تھے میں نے بہت سی کتابیں اس حوالے سے ان سے لے کر پڑھیں جن پر مرزا صاحب بعد میں مزید روشنی بھی ڈالا کرتے تھے۔ اپنی کتابوں کی دکان پر کھڑے وہ قطعاً دکاندار نہ لگتے تھے ایک تو وہ وہاں بیٹھے لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے اور دوسرا کتاب کی قیمت لیتے وقت اکثر ہچکچایا کرتے اور تقریباً اصل قیمت پر ہی کتاب دے دیا کرتے تھے۔ چالیس سال پر پھیلی ہوئی اس دوستی میں صرف ایک بار میرے گھر آئے اور تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی جس کا موضوع سانپ تھے۔ میرے پاس پرانی فلموں کی کافی تعداد موجود تھی جب انہیں پتا چلا تو پھر وہ فلمیں مجھ سے لے گئے اور واپسی کا وعدہ بھی اسی وقت کر لیا۔ جن موضوعات کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے تھے قطعاً بات نہ کرتے۔ بہرحال ان کا تعلیمی اور تحقیقی کام قابلِ تحسین ہے۔ قدیم تاریخ کے حوالے سے جو کام وہ کر گئے ہیں وہ ایفل ٹاور سے بھی بڑا کام ہے۔ مرزا صاحب کا کردار بڑا استقامت کا کردار تھا۔ اس کردار کے لحاظ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ بسلسلۂ روزگار مختلف شہروں میں سکونت اختیار کرتے رہے اگر وہ چاہتے تو آثار قدیمہ کے محکمے سے کوئی اچھی پوسٹ حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے کبھی ایسا نہ سوچا ان کی زندگی میں اپنے لیے ذاتی اثر و رسوخ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ انہیں پاکستان سے گہری عقیدت و محبت تھی۔ تحقیق کے دوران قبل مسیح کی تاریخ (وادیٔ سندھ) کے بارے میں یا کسی اور قدیم تاریخ پر لکھتے ہوئے اگر کوئی حوالہ پاکستان سے آ جاتا تو اس علاقے کو پاکستان کے لفظ کے ساتھ ہی رقم کرتے تھے اس ساری مصروفیت میں وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کیسے وقت نکالتے ہوں گے اور کس طرح سے لکھنے پڑھنے کو وقت دیتے ہوں گے یہ سوال ہمارے لیے بہت سے سبق آموز جوابات رکھتا ہے۔ ان تمام نامساعد حالات کے باوجود وہ اپنے

کام کو لگن، محنت، محبت، خلوص اور ایمانداری سے نبھاتے رہے۔

پروفیسر اصغر علی شاہ نے کہا کہ میں مرزا ابنِ حنیف کے انتقال پر نوحہ لکھنا چاہتا تھا مگر قلیل وقت کی وجہ سے نہ لکھ سکا انشاءاللہ میں آرٹس فورم کے اگلے اجلاس تک یہ ضرور پیش کر کے اپنا فرض نبھاؤں گا۔ قدیم تہذیب کے بارے میں جو معلومات ان کے پاس تھیں وہ بہت مستند تھیں ملتان میں قلعے کی کھدائی کے دوران سخت دھوپ میں صبح سے شام تک وہیں کھڑے رہتے اور اس کھدائی میں سے ملنے والی پرانی اشیاء کو اکٹھا کرتے جاتے تھے۔ اس طرح انہوں نے آثارِ قدیمہ کا ایک خزانہ جمع کر لیا ہمیں بھی بلا کر دکھایا کرتے تھے۔ پرانی تہذیبوں پر جو عربی، فارسی یا یونانی سے انگریزی ترجمہ ہوئیں وہ سب ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ علم و ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ درویشانہ زندگی ان کا اخلاق اور ان کی خودداری با کمال تھی۔

ڈاکٹر محمد امین نے کہا میں یہ بات فخر سے کہہ رہا ہوں کہ میری مرزا صاحب سے گہری دوستی تھی۔ ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔ ان کی خوبیوں سے احباب واقف ہیں۔ مرزا صاحب با اُصول شخص، درویش صفت اور خوددار انسان تھے ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں منہمک رہتے تھے اور علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ سانپوں کے بارے میں بہت تحقیق کی۔ فیثا غورث پر بھی تحقیق کر رہے تھے۔ قدیم تہذیبوں کے حوالے سے پاکستان میں جتنا کام انہوں نے کیا ہے اتنا زیادہ کام ہمیں کسی شخص کا نہیں ملتا۔

یہ بہت مشکل کام ہے کہ انگریزی زبان کی کتابوں کو پڑھ کر ان کا نچوڑ پیش کیا جائے۔ انہوں نے مفصل اور بھرپور تحقیقی کتابیں دیں۔ پاکستان کی تاریخ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب گنگا جمنی تہذیب سے مختلف ہے اس سلسلے میں مرزا صاحب کی کتاب ''سات دریاؤں کی سرزمین'' ایک تحقیقی کام ہے۔ بڑے گہرے مطالعے اور جانفشانی سے کام کیا۔ لکھنے کا انداز یہ تھا کہ اگر ایک لفظ غلط ہو جاتا تو ساری عبارت کو دوبارہ لکھتے تھے جب تک مطمئن نہ ہو جاتے کسی بات کو نہیں لکھتے تھے۔ میرے ذمے بہت سے کام لگائے مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ تم شہرت اور مقبولیت کے پیچھے پڑ گئے ہو تمہارا اصل کام فلسفہ اور نفسیات پر ہے۔ جب میں شاہ رکنِ عالم کالونی میں منتقل ہو گیا تو اکثر یاد فرمایا کرتے تھے۔ وفات سے کچھ روز پہلے بھی ملاقات ہوئی اس میں بھی میرے کام کی نوعیت پر بات کی۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے ملتان میں ایسی بے شمار شخصیات ہیں جنہوں نے بہت کام کیا مگر ملکی سطح پر ان حضرات کو پذیرائی نہیں ملی۔ یہ المیہ ہے اگر ہم شماریات سے کام لیں تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے علاقے کے لوگوں کا کام بہت اچھا ہے چاہے وہ مقدار ہو یا معیار۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرزا صاحب جیسے لوگ ہمہ وقت ہمارے درمیان موجود رہے جنہوں نے صحیح سمتوں میں کام کروایا۔ ایک دور میں براہوی زبان پر بھی تحقیق کی کبھی بھی Authoritative نہیں رہے حالاں کہ ان کے پاس علم کا بڑا خزانہ تھا۔

ڈاکٹر نعمت الحق نے کہا کہ میرا ان سے تعلق ۱۹۸۴ء سے ہے جب وہ امروز میں کام کرتے تھے۔ انہیں دنوں میں نے علامہ فکری اور مرزا صاحب پر کام کرنا شروع کیا۔ ۸ بجے کے قریب واپس آتے تھے ۹ بجے گفتگو شروع کر دیتے تھے اور عام طور پر بارہ ساڑھے بارہ بجے تک رہنمائی فرماتے تھے۔ بڑا اٹف

معمول تھا مگر کام باقاعدہ کرتے تھے۔ مرزا صاحب مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ مضبوط ارادے اور کمٹ منٹ کے پکے تھے۔ اگر انہیں دوبارہ لکھنے کی عادت نہ ہوتی تو ان کا کام بہت زیادہ ہوتا۔ ان کے اس کام میں ان کی Family کا بڑا ہی Contribution ہے۔ تنخواہ لا کر بیگم کو دے دیتے تھے اور بے فکر ہو جاتے تھے۔ فیملی نے بھی انہیں کبھی تنگ نہ کیا۔ پیدائش کلیانہ میں ہوئی جو دلی کے قریب پچاس میل پر ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک مسجد تھی جو مندر کو گرا کر بنائی گئی تھی وہاں دیواروں پر مورتیوں کی تصاویر بھی تھیں وہاں کچھ قدیم آثار تھے جن سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس گاؤں میں سانپ بھی بہت تھے جس کی وجہ سے ان کی دلچسپی سانپوں میں بڑھ گئی۔ کتاب اس لیے نہیں لائے کہ سانپوں کے معاملہ میں وہ پوری دنیا سے معلومات اکٹھی کرنا چاہتے تھے۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں پیدائش ہے۔ والدین کی تربیت پر بڑا گہرا اثر تھا۔ والد محترم مظفر گڑھ، بہاولپور، بہاولنگر سے ہوتے ہوئے ملازمت کی غرض سے آخر کار ملتان آئے۔ انہوں نے ایمرسن کالج سے ایف اے پاس کیا۔ پروفیسر منور علی خاں صاحب استاد تھے۔ بی اے کے امتحان میں تاریخ کے پرچے میں فیل ہو گئے اور یہیں سے جذبہ پیدا ہوا۔ ہسٹری سوسائٹی کے تحت جو کہ کالج ہی میں قائم تھی ایک دفعہ موہنجوداڑو گئے۔ اسٹیشن پر تمام لوگ آرام کر رہے تھے گاڑی کی سیٹی کی آواز سن کر مرزا صاحب اس طرف بھاگ پڑے جب گاڑی گزر گئی وہ بھاگتے ہوئے جنگل میں گم ہو گئے اس پراسرار ماحول نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا اور یہیں سے ہڑپہ، قدیم تہذیب، پراسرار ماحول ان سب کا تاثر ایسا نقش ہوا کہ وہیں سے مرزا صاحب کہتے ہیں کہ مجھے قدیم تہذیبوں پر کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ ان کی زندگی کا بہت بڑا ٹرننگ پوائنٹ تھا جب کوئٹہ میں معلم کی حیثیت سے گئے تو خلیل صدیقی صاحب سے بھی تعلق رہا۔ انہوں نے رشید احمد صاحب کو ہی اپنا واحد دوست گردانا ہے۔ قیام کے دوران پرانے ٹیلوں سے دوستی ہوئی۔ کراچی میں مرزا صاحب کی شادی ہوئی۔ پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے جو نمائش ملتان میں منعقد ہوئی تھی اس کا سارا کام تقریباً مرزا صاحب نے ہی کیا وہیں سے روزنامہ امروز کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر نے انہیں امروز اخبار میں لے لیا کتابوں کی دکان بند ہو گئی اور جب تک امروز اخبار رہا اسی سے ہی وابستہ رہے۔ انسان دوستی کے حوالے سے بہت اچھے انسان تھے۔ دوستوں کے لیے زندگی بھر قربانیاں دیتے رہے۔ سیلاب کے دنوں میں اکثر سیلاب زدگان کی مدد کرتے تھے۔ انتہائی ضرورت کے موقع پر بھی کسی سے مدد طلب نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر عامر سہیل نے کہا کہ مرزا صاحب کے ساتھ میرا تعلق ۱۹۸۵ء سے شروع ہوا جب میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا مرزا صاحب اس امروز اخبار کے دفتر میں ہی ہوتے تھے اور میں ایک مضمون لے کر مرزا صاحب کے پاس گیا اور اسے اخبار سے شائع کرانے کی خواہش کی اور وہ مضمون بعد ازاں شائع بھی ہو گیا۔ اُردو اکیڈمی میں بڑے ریگولر آتے تھے میری ان سے بڑی جذباتی قسم کی Attachment تھی۔ انہوں نے باقاعدہ شفقت کا ہاتھ آخری دم تک میرے سر پر رکھا۔ ہفتے میں ایک بار گھر آتے تھے اور صبح سے لے کر شام تک بیٹھتے اور بعض اوقات قدیم تاریخی موضوعات پر فلمیں بھی مل کر دیکھتے، اکثر دوست وہیں آ کر ملتے تھے۔ میں مرزا صاحب کی خودداری کا قائل تھا۔ اُن کی شفقت کے

تحت بعض اوقات مختلف موضوعات پر ان سے لڑ بھی لیا کرتا تھا مگر وہ لفظ اور جملہ بڑا ناپ تول کر بولتے تھے اور اکثر وہ ہمیں قائل کر لیتے تھے۔ بحث کے موضوعات اکثر سیاست اور پاکستان کے حالات ہی بنتے تھے۔ میں ان سے اکثر کتابوں کی اشاعت کے معاملہ پر بھی اختلاف کرتا تھا۔ ان کتابوں کی اشاعت کا کچھ ریٹرن ہونا چاہیے لیکن وہ اس بات کو قبول نہیں کرتے تھے۔ بعض دوسرے پبلشرز بارہا اُن کے پاس آئے مگر انہوں نے اکثر انکار ہی کیا۔ ہم دوست ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھوتے اور نئے نئے موضوعات لے کر آتے کہ ان پر مرزا صاحب کچھ نہیں جانتے ہوں گے مگر جب بات چل نکلتی تو ہم حیران ہوتے کہ مرزا صاحب اسے پہلے سے ہی جانتے ہیں۔ شاید یہ احساس ہمیں کہیں بعد میں جا کر ہوا کہ وہ کتنے بڑے اور اچھے انسان تھے۔ ان کے پاس دولت حاصل کرے بڑے مواقع تھے جن سے وہ آسائشیں حاصل کر سکتے تھے۔ پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مرزا صاحب نے کوئی کام ذمے لگایا جو میں بروقت نہ کر سکتا تھا اور بڑا ڈر رہا تھا کہ کہیں مرزا صاحب کا سامنا نہ ہو جائے آخر ایک دن ملے اور بولے تم اب تب آؤ گے جب میں مر جاؤں گا اس کے بعد دوبارہ کوئی ناراضگی نہ ہوئی اور ان کے ساتھ تعلق قائم رہا۔

مرزا ابن حنیف کے اہل خانہ میں سے جناب اقبال احمد گویا ہوئے کہ میں مرزا صاحب کی بیٹی کو ساتھ تو لے کر آیا ہوں مگر وہ اس شرط پر آئی تھیں کہ انہیں وہاں بولنے کے لیے نہ کہا جائے (اور شاید وہ بات نہ ہی کر سکتی ہوں کیونکہ اس ساری تقریب کے دوران میں نوٹ کر رہا تھا کہ ان کی بیٹی کے آنسو خشک نہیں ہوئے جو باپ کی باتوں اور یادوں کو بڑے حوصلے کے ساتھ سن رہی تھیں) اقبال احمد صاحب نے کہا کہ میری اُردو بڑی ناقص ہے مگر سب کی محبت آمیز باتوں سے جو تاثر ملا ہے میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ مرزا صاحب کی صفات اور علم جو نوجوانوں اور بزرگوں تک پہنچا ہے اگر یہ سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں تک پہنچتا رہے تو میرا خیال ہے کہ یہی مرزا صاحب کی محبتوں کا صحیح انداز ہوگا۔

ڈاکٹر علی اطہر نے کہا کہ میرا مرزا صاحب سے بڑا کم تعلق رہا۔ جب ملتان آرٹس فورم ملتان نے پانچ سالہ جشن کارکردگی کا فنکشن منعقد کیا تو اس میں لائف ٹائم ایوارڈ بھی پیش کیے گئے اس سلسلہ میں پہلا نام مرزا ابنِ حنیف کا تھا مگر وہ اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ عامر سہیل، خالد سعید اور نعمت الحق کی دو ہفتوں کی محنت کے بعد وہ تقریب میں آنے پر راضی ہوئے اور ہم نے یہ سیکرٹ رکھا کہ وہاں دورانِ تقریب انہیں بلائیں گے اور ایوارڈ دیں گے جب انہیں بلایا گیا تو مرزا صاحب نے ہمارا مان رکھا اور وہ ایوارڈ لینے کے لیے آ گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر علی اطہر نے مرزا صاحب کے لیے منظوم کلام پڑھ کر سنایا جس میں ان کی شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں کا ذکر تھا۔

آغا صدف مہدی نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں مرزا صاحب سے کبھی نہیں مل سکا انہوں نے اشعار پڑھ کر مرزا صاحب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور پھر کہا کہ مجھے ساری زندگی یہ افسوس رہے گا کہ میں اتنے بڑے انسان سے ملتان میں آنے کے باوجود نہ مل سکا۔

احمد ندیم تونسوی نے کہا کہ میرا تعلق مرزا صاحب سے ۱۹۸۲ء سے ہے جب میں طالب علم

تھا۔ ان سے ملنے کے بعد دہشت کے ساتھ احترام یا احترام کے ساتھ دہشت کی بات درست معلوم ہوتی تھی۔ جب بھی کوئی علمی نکتہ پوچھا انہوں نے ہمیشہ اس کے متعلق چار باتیں آگے کی ہی بتانا ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ سر آپ مرہٹوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں تو انہوں نے اتنی تفصیل سے بتایا کہ میں سیر ہو گیا۔ ایسا شخص جس کے جنازے کے ساتھ نوجوان نسل کی کثرت ہو وہ شخص حال میں بڑا ہوتا ہے اور حال ہی سے جڑا ہوتا ہے اور مرزا صاحب کا جنازہ اس کا بین ثبوت ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی بزرگ کو اس قدر نوجوانوں سے خلوص کے ساتھ جڑا ہوا نہیں دیکھا جیسے مرزا صاحب جڑے ہوئے تھے۔ وہ Refrence Cabinet تھے وہ واقعی علم دوست تھے اور اُن سے مل کر علم کی پیاس اور بڑھ جاتی تھی۔

عطاء الرحمٰن تمثیل نے کہا کہ جہاں تمام دوستوں کی ملاقاتیں اور یادداشتیں ختم ہوتی ہیں میری وہیں سے مرزا صاحب سے ملاقاتیں شروع ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ انہیں اُردو اکیڈمی کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا ان کی باتیں سن کر ملنے کا اشتیاق ہوا اور میں پہلی مرتبہ ریحان اقبال کے ساتھ مرزا صاحب سے ملا۔ مرزا صاحب ریحان سے کسی تاریخی واقعے پر بات کرتے کرتے اچانک متوجہ ہوئے، میں نے تعارف کروایا تو میاں چنوں کے نام پر فوراً بولے کہ کچھ عرصہ پہلے وہاں ایک نوجوان سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تھا جب میں نے بتایا کہ وہ دوست تھا پوری تفصیل واقعے کی پوچھی اور بعد میں کہا کہ اس نسل کے سانپ کے دانت اگر توڑ بھی دیں تو کچھ عرصے میں نکل آتے ہیں بس انہیں اس بات کا علم نہیں ہوگا۔ پھر ایک دن ملاقات کے دوران علمِ کیمیا گری کی بات چل نکلی اور میں نے اچھا خاصا لیکچر دے دیا مجھے اپنی کم علمی کا احساس اور مرزا صاحب کے علم کا ادراک اس وقت ہوا جب انہوں نے اس علم کے انتہائی عمیق نکتوں پر روشنی ڈالنا شروع کی اور مجھے دو کتابیں پڑھنے کے لیے دیں پھر یہ سلسلہ جاری رہا کبھی اکیلے کبھی حسنین ملک اور ریحان کے ساتھ آنا جانا لگا رہا اور اس عظیم انسان سے فیض حاصل کرتا رہا مجھے افسوس اس بات کا رہے گا کہ میرا ان سے تعلق بہت قلیل عرصہ کے لیے رہا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ڈاکٹر فاروق عثمان نے کہا کہ یہ امر ربی ہے جسے انسان کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ ہم میں سے کوئی نہیں چاہتا تھا کہ ان جیسی شخصیت ہمارے درمیان سے اُٹھ جائے۔ یہ خلا کبھی پُر نہیں ہو سکتا خدا کی نظر میں یہی پسندیدہ عمل ہے کہ اس کی رضا کے سامنے سر جھکا دیا جائے۔ خدا نے انہیں جتنی زندگی کی مہلت دی انہوں نے اسے محنت سے اور نہایت احسن طریقے سے نبھایا اُن کا ہم پر جو بھی حق تھا وہ ادا کر گئے جو کچھ ہم نے اُن سے لینا تھا وہ انہوں نے دیا صرف علم ہی نہیں دیا بلکہ انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ اپنے جونیئرز اور نوجوانوں کو اعلیٰ تربیت اور زندگی کے قیمتی اُصول بھی دیئے جوان کا فرض بنتا تھا وہ نبھا گئے۔ اب وہ اس سے بری الذمہ ہیں خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اس کے بعد مرحوم مرزا ابنِ حنیف کے ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ پڑھی گئی اور اس ادبی ریفرنس کے اختتام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔

☆☆☆